ذوق فطری ہے، چنانچہ وہ طالب علمی ہی کے زمانہ سے مشق سخن کرتے تھے، مگر ابتدا سے ان کا ذوق بلند اور ستھرا تھا، اس لیے اس دور کی شاعری بھی رسمی غزل سرائی کے ابتذال سے پاک اور پاکیزہ تغزل کا نمونہ ہے، عارف تھانوی سے ارادت کے بعد یہ شراب دو آتشہ ہو کر شراب طہور بنگئی اور بادۂ عرفان کی مستی اور وادی ایمن کی شرربار یاں نظر آنے لگیں، صہبائے عارفی اسی میخانۂ عرفان کی صہبا ہے، اس دور کا کلام محض شاعری نہیں بلکہ ایک صاحب دل کی آواز ہے، اس لیے خیالات کی لطافت و پاکیزگی، واردات قلبی، سوز و مستی گوناگوں باطنی کوائف سے معمور اور اس کا ہر شعر بادۂ معرفت کا چھلکتا ہوا جام ہے، زبان نہایت شستہ و رفتہ، انداز بیان شگفتہ اور اشعار ڈھلے ہوئے سے معلوم ہوتے ہیں، حسن ظاہری بھی نفاست و لطافت کا مرقع ہے، یعنی جیسی مصفا و پاکیزہ صہبا ہے ویسا ہی شفاف شیشہ و ساغر ہے، اور اس لائق ہے کہ اصحاب ذوق اس سے لطف اندوز ہوں۔

(م)

فارم IV

دیکھو رول نمبر ۸

معارف پریس اعظم گڈھ

مقام اشاعت	… … … دار المصنفین اعظم گڈھ
نوعیت اشاعت	… … … ماہانہ
نام پرنٹر	… … … صدیق احمد
قومیت	… … … ہندوستانی
پتہ	… … … دار المصنفین اعظم گڈھ
نام پبلشر	… … …
قومیت	… … …
پتہ	… … … دار المصنفین اعظم گڈھ
نام اڈیٹر	… … … شاہ معین الدین احمد ندوی
قومیت	… … … ہندوستانی
پتہ	… … … دار المصنفین اعظم گڈھ
نام و پتہ مالک رسالہ	… … …

میں صدیق احمد تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم و یقین میں صحیح ہیں۔ صدیق احمد

جلد ۹۹ ماہ ذی الحجہ ۱۳۸۶ھ مطابق ماہ اپریل ۱۹۶۷ء عدد ۴

مضامین

شذرات

ستمبر ۱۹۶۶ء کے معارف میں ناظرین کو یہ اطلاع دی گئی تھی کہ دارالمصنفین سے دو نئی کتابیں مقالات سلیمان اور ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں شائع ہوئی ہیں، اس مہینہ میں چار اور نئی کتابیں دین رحمت، صاحب المثنوی، عہد مغلیہ مسلمان و ہندو مورخین کی نظر میں جلد اول اور کشمیر سلاطین کے عہد میں چھپکر تیار ہیں، دین رحمت میں یہ دکھایا گیا ہے کہ اسلام بلا تفریق مذہب و ملت اور دوست و دشمن سارے انسانی طبقوں بلکہ پوری کائنات کیلئے سراسر عدل و رحمت ہے، صاحب المثنوی میں مولانا جلال الدین رومی کی مفصل سوانح عمری ہے، عہد مغلیہ مسلمان و ہندو مورخین کی نظر میں جلد اول میں ظہیر الدین محمد بابر بادشاہ کے جنگی، سیاسی، علمی، تمدنی اور تہذیبی کارنامے عہد مغلیہ اور دور جدید کے مسلمان اور ہندو مورخین کی اصلی تحریروں کی روشنی میں پیش کیے گئے ہیں، چوتھی کتاب "کشمیر سلاطین کے عہد میں" ہے جس میں مغل فرمانرواؤں سے پہلے جن مسلمان حکمرانوں کی حکومت کشمیر میں رہی، اس کی بہت ہی مستند سیاسی اور تمدنی تاریخ قلمبند کی گئی ہے۔

سندھی ہندوستان کی قومی زبانوں میں قانونی طور پر تسلیم کرلی گئی ہے، اس کو تسلیم کرتے وقت حکومت ہند کے وزیر داخلہ نے فرمایا کہ اس کو جائز مقام دیا جارہا ہے، جو ابتک نہیں دیا گیا تھا، اس اعلان سے ہر ہندوستانی کو خوشی ہوگی، مزید مسرت کی یہ بات ہے کہ اب پارلیمنٹ میں اسکے ہر رکن کو اپنی مادری زبان میں تقریر کرنے اور سوالات پوچھنے کی اجازت ہوگی، ہندوستان کی مختلف زبانوں کے ساتھ یہ فراخدلی اس بات کا ثبوت ہے کہ لسانی سامراجیت اور استبداد کے بجائے اب لسانی جمہوریت اور رواداری کا خیال بڑھ رہا ہے، لیکن افسوس ہے کہ شمالی ہند میں ابتک اردو کو وہ جائز مقام نہیں مل سکا جس کی وہ مستحق ہے، ۱۹۴۷ء کے بعد اردو کی مخالفت کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ ہندوستان کے اردو بولنے والے مسلمانوں کی اکثریت نے پاکستان بنوایا ہے، تو یہ زبان اب صرف پاکستان ہی میں بولی سمجھی اور پڑھی جائے اور وہیں کی زبان بنکر رہے، لیکن پاکستان کی زبان بنگالی بھی ہے اور سندھی تو خالص اسکے ایک علاقہ کی زبان ہے، جب ہندوستان میں پاکستان کی ان

زبانوں کے خلاف کوئی منافرت کا جذبہ نہیں ہے، بلکہ ان کی پوری سرپرستی کی جارہی ہے، تو پھر اردو کو جو خالص ہندوستانی زبان ہے، اس کے حقوق سے ابتک کیوں محروم رکھا گیا ہے،

یہ عجیب بات ہے کہ ۱۹۴۷ء کے بعد اردو زبان جتنی زیادہ دبائی گئی اتنی ہی زیادہ ابھری، مختلف علوم و فنون پر اس میں جو کتابیں برابر نکل رہی ہیں، وہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے ہندوستان کی کسی اور زبان سے کمتر نہیں ہیں، اس کا اعتراف مرکزی حکومت اردو کی کتابوں پر ساہتیہ اکیڈمی کی طرف سے ہر سال انعام دیکر کرتی رہتی ہے، پھر ہندوستان کے ادیب اور شاعر جو وطنی خدمات انجام دے رہے ہیں اسکی مثال ہندی کے علاوہ ہندوستان کی کسی اور زبان میں شاید ہی ملے، وہ پاکستان کے ادیبوں اور شاعروں سے ذہنی جنگ میں بھی مصروف ہیں، اور جو نہیں ہیں ان کو وفادار نہیں کہا جاتا، لیکن وفاداری کیلئے دلداری کی بھی شرط ہوتی ہے، جیسی دلداری ہوگی ویسی ہی وفاداری بھی ہوگی، اب اردو کی بین الاقوامی حیثیت بھی ہوگئی ہے، لندن، ماسکو، تاشقند، واشنگٹن، پیکنگ، طہران، انقرہ، قاہرہ، کابل اور جدہ وغیرہ سے اردو میں روزانہ خبریں نشر ہوتی ہیں، ہندوستان میں روسی اور امریکی سفارت خانوں کی طرف سے اردو میں رسالے بھی شائع ہوتے رہتے ہیں، خود ہندوستان کے ریڈیو سے بھی اب اردو میں خبریں سنی جاتی ہیں، ریڈیو میں پاکستان سے اعصابی جنگ تو اردو ہی کے ذریعہ ہوتی ہے، سری نگر، جموں اور جالندھر کے ریڈیو تو پاکستان کو اردو ہی میں مخاطب کرتے ہیں، یہ بھی معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ دہلی ریڈیو میں اردو میں اٹھارہ گھنٹوں کا پروگرام ہوتا ہے جن میں کچھ پاکستان والوں کیلئے مخصوص ہوتا ہے، اسمیں مشاعرے بھی ہوتے ہیں، اچھے اچھے فیچر بھی سننے میں آتے ہیں، جذباتی ہم آہنگی اور قومی یکجہتی پر اردو میں اچھی سی اچھی تقریریں بھی ہوتی رہتی ہیں، اردو مجلس کے پروگرام تو پورے ہندوستان میں شوق سے سنے جاتے ہیں، کیا ریڈیو پر اس زبان کے ساتھ حکومت کی یہ توجہ اسکی اہمیت اور افادیت کے لحاظ سے ہے یا محض اسلئے ہے کہ اسکو نشر کرکے اس سے یہ احساس بھی دور کرادیا جائے کہ

ادا سے آڑ میں خنجر کی منہ چھپائے ہوئے
مری قضا کو وہ لائے دلھن بنائے ہوئے

گذشتہ انتخاب کے موقع پر بھی اردو کی اہمیت کا اندازہ ہوا، بہار میں جن سنگھ کے امیدواروں کے بھی

اشتہارات اردو میں جابجا چپکائے گئے، دہلی کی ایک ٹرک کو تو کپڑے پر اردو کے خوبصورت جلی حروف میں یہ پڑھنے کا موقع ملا "جفا کا لایا ہوا انقلاب زندہ باد"، "ہندو مسلم اتحاد زندہ باد"، "جن سنگھ راج زندہ باد"، بہار کی غیر کانگریسی حکومت کے منشور میں یہ بھی ہے کہ وہ وہاں اردو زبان کو قانونی حیثیت سے تسلیم کریگی، اور اب یہ بالکل ظاہر ہو چکا ہے کہ بہار اور یوپی میں کانگریسی حکومتوں نے اردو زبان کو اسکا جائز حق دیدیا ہوتا تو انکے برے دن نہ آتے، امید ہے کہ کانگریسی اور غیر کانگریسی حکومتیں دونوں اس تلخ تجربہ سے سبق لیکر اردو کیساتھ وہ رویہ نہ اختیار کرینگی جو اب تک کیا جا رہا ہے،

وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے پارلیمنٹ میں اپنی تقریر میں صرف اتنا کہنے پر اکتفا کیا ہے کہ وہ ریاستوں کے وزرائے اعلیٰ سے اردو کے متعلق گفتگو کرینگی، لیکن اب تقریروں اور وعدوں سے محض تسلی دینے کا وقت نہیں رہا، ع کہ خوشی سے مرجاتے اگر اعتبار ہوتا۔ اردو بولنے والے کھلونے دیکر کافی دنوں تک بہلائے جا چکے ہیں، وہ اب ستم کو کرم اور جفا کو وفا سمجھنے کیلئے تیار نہیں ہیں، وہ زبانی نہیں بلکہ قانونی تحفظ چاہتے ہیں، حکومت کو صحیح اندازہ ہے کہ زبان کا مسئلہ بہت جذباتی ہوتا ہے، ہندوستان کے ہر حصہ میں لسانی تحفظ کا اظہار ہو رہا ہے، آسام میں بنگالی اور آسامی جھگڑے میں خونریزی ہو چکی ہے، جنوبی ہند زبان کے مسئلہ پر مرکز سے بغاوت کرنے کیلئے تیار ہے، پنجاب میں پنجابی زبان کے نام پر کیا کیا نہیں ہو چکا ہے، اسی طرح اردو کی ناانصافی پر اردو بولنے والوں کے جذبات میں جو مد وجزر پیدا ہو رہا ہے، اس کو نظر انداز کرنا رموز حکمرانی کے سراسر خلاف ہے، اردو بولنے والے اپنی خاموش زبان سے کہہ رہے ہیں

چھاتی جلا کرے ہے سوز دروں بلا ہے
اک آگ سی رہے ہے کیا جانئے کہ کیا ہے

یوپی میں اردو بولنے والوں کے بچوں کے سوا ہندوستان کا ہر بچہ اپنی مادری زبان میں تعلیم پا رہا ہے، انکے بچوں کو آخر ایک فطری نعمت سے کیوں محروم کیا جا رہا ہے، کیا اردو بولنے والے برابر کے شہری نہیں، کیا انکو ہندوستان کے دستور میں وہ حقوق حاصل نہیں جو اور شہریوں کو ہیں، کیا انکی زبان بہت ہی فرومایہ ہے، کیا انکی زبان میں ہندوستانی کلچر اور تہذیب کا سرمایہ نہیں ہے؟ مرکز اور ریاستوں کی حکومتوں سے تو وہ یہ کہنا ہے

کوئی ان سے کہے منہ پھیر کر تم قتل کرتے ہو
تڑپتا ہے تمہارا کشتہ کیونکر دیکھتے جاؤ

اور خود اردو بولنے والوں سے یہ کہنا ہے

یہ بزم مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

مقالات

ذلک الفوز العظیم

سفرنامۂ حج مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی مرحوم

(۳)

رویائے عظیمہ

(بلحاظ جلالت شان اس مبارک خواب کا مستقل عنوان قائم کیا گیا ہے)

۱۶ صفر المظفر روز چارشنبہ کی مبارک شب کو مراجعت مدینہ طیبہ کے بعد، منزل بیر الشیخ اور مستورہ کے درمیان ایک بجے کے وقت میں ایک عظیم الشان رویاء سے مشرف ہوا،

بعونہ و نعمتہ تعالیٰ میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک کشادہ میدان میں برابر برابر دو خس پوش بنگلے بنے ہوئے ہیں، ان کے احاطے جدا جدا ہیں، احاطوں میں درخت نصب ہیں جن میں بڑے بڑے درخت بھی ہیں، ایک بنگلے میں بطور مہمان حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم، عاجز کا قیام ہے، اسی اثناء میں حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے مع ایک رفیق کے میرے قیام گاہ کے بنگلے کے احاطے میں ورود فرمایا، اس طرح کہ جیسے کوئی کہیں جاتے جاتے مہمان پرسی کے لیے اس کے قیام گاہ پر ہو جائے، ایک کمیت گھوڑا میانہ قد، خوبصورت عربی النسل (اس جوڑ بند کا جیسی ایک بچھیری

مدینہ شریف میں علی شحاد مجھکو دیتے تھے) زین کسا ہوا احاطہ میں کھڑا تھا، حسب ارشاد میں سوار ہوا، اس خیال و یقین کے ساتھ کہ یہ محض مہمان نوازی وغریب پروری ہے، ایک جانب دست راست مبارک سے حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی باگ پکڑلی اور دست چپ سے دوسری جانب سے دوسرے بزرگ نے جو ذات اقدس سے صورتاً ولباساً اشبہ تھے،

جسم مبارک دبلا تھا، ریش مبارک دراز تھی، لباس مبارک اُجلا نہ تھا، دوسری جانب کے بزرگ بھی اسی صورت ولباس کے تھے، دل میں از خود خیال آیا کہ یہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں، یہ خیال برابر دل میں قوت کے ساتھ آتا رہا کہ یہ محض عاجز نوازی اور غریب پروری ہے، میرے قیام کے بنگلے میں رونق افروزی بھی اسی قصد سے فرمائی گئی، ورنہ اصل مقصد دوسرے بنگلے میں تشریف بری کا ہے، غرض اسی ہیئت مبارک سے گھوڑا احاطہ سے باہر آیا، اور سامنے کے میدان کی جانب چلا، اس وقت بھی یہ خیال آیا کہ دوسرے بنگلے کے قریب کے راستے کو ترک فرما کر میدان کی جانب تشریف فرمائی بھی بخیال مذکورۂ بالا ہے، گھوڑا چلتا تو آہستہ تھا، مگر بڑے بناؤ اور قدیم روش کی چلبلی رفتار سے (جس کی اگلے شہسوار تعلیم دیتے تھے) چاروں ڈنڈے پھاڑتا ہوا کھیلتا چل رہا تھا، رفتار کے انداز بھی بدلتا جاتا تھا، اور کئی طرح سے قدم ڈالتا لیکن سب آہستہ۔

دوسرے صاحب گھوڑے کی رفتار کی برابر تعریف فرماتے جاتے اور رفتار کے اقسام کا نام ظاہر فرماتے، مگر میں اس کا مخاطب نہ تھا، تمام راستے میں مجھ سے کوئی کلام نہیں فرمایا گیا، اسی طرح دور تک گھوڑا آگے بڑھتا چلا گیا، اس کے بعد دوسرے بنگلے کیجانب مراجعت فرمائی ہوئی، اس اثناء میں حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ الفاظ ارشاد فرمائے،

"انتظام گڑبڑ ہے، جائزہ دلوا دیا جائے گا"

اس کے بعد دوسرے بنگلے میں داخل ہوئے، میں گھوڑے سے نیچے اتر آیا، اسوقت بھی

زبان مبارک اور رفیق مبارک کی زبان پر گھوڑے کی رفتار کی تعریف تھی، اس وقت میں نے رقت آمیز آواز سے عرض کی

"یارسول اللہ میرے فخر کی بھی انتہا نہ رہی"

بآواز بلند فرمایا "بے شک"۔ اس کے بعد بنگلے کے اندر قدم رنجہ فرمایا۔ کمرے میں ایسا سماں تھا جیسے کچہری ہو، حاکم صدر میں کرسی پر تھا، میز سامنے تھی، اہل دفتر اور اہل معاملہ سے کمرہ بھرا ہوا تھا، حاکم کا چہرہ گورا تھا مگر میلا، داڑھی منڈھی ہوئی، دونوں جانب صرف قلمیں، سر پر میلی پگڑی تھی، گردن جھکائے لکھنے میں مصروف تھا، انگریزی لکھ رہا تھا، قریب پہنچکر ارشاد فیض بنیاد ہوا، جائزہ دیدو، ان الفاظ کے ادا ہوتے ہی حاکم معاً قلم ہاتھ سے رکھکر کھڑا ہو گیا، اس کے بعد دوسرے کمرے میں میں تنہا گیا، وہاں بھی یہی سماں تھا، دل میں یہ خیال خود بخود پیدا ہوا کہ یہ نائب حاکم ہے، وہ نائب بھی مصروف تحریر تھا، شکل وصورت بھی وہی تھی، اسی حالت میں اس نے یہ چیز سنی کہ جائزہ دلوا دیا گیا۔ اس نے بھی فی الفور قلم روک کر ہاتھ سے رکھ دیا، اس کے بعد آنکھ کھل گئی، گھڑی دیکھی تو ایک بجا تھا، ہوا سرد چل رہی تھی، چاندنی کا دریائے نور میدان میں موجزن تھا، جلالت خواب سے متاثر ہو کر میں فوراً سجدۂ شکر میں گرا، دیر تک حمد باری تعالیٰ کرتا رہا، سر اٹھایا تو معلوم ہوا کہ سجدہ مدینہ شریف کی جانب ہوا ہے

بیت

غش کھا کے داغ یار کے قدموں پر گر پڑا بیہوش نے بھی کام کیا ہوشیار کا

دوبارہ سجدۂ شکر کعبۂ محترم کیجانب کیا، خواب سے آنکھ کھلنے پر معاً یہ خیال بھی آیا تھا کہ یہ خواب دو صاحبوں سے بیان کروں گا، ایک مولانا سید سلیمان اشرف صاحب سے دوسرے مولوی سید مناظر احسن صاحب سے

اس کے بعد قلب و دماغ کا کیا عالم تھا یہ کون بتا سکتا ہے، اس شعر کو یاد کرو ؎

خوشا نصیب کہ حسرت چلا دینے کو زہے آنکھ کو ہو تہنیت جو سینے کو

دیکھو آنکھ نے کیا دیکھا، سینے کو کیا سرور ملا، یہ بھی سن لو کہ حضرت شیخ دہلوی قدس سرہ العزیز نے جو دعا جذب القلوب میں داخلۂ حرم محترم نبویؐ کے وقت کی تلقین فرمائی تھی، اس میں یہ مبارک الفاظ بھی تھے:

دار زقنی فی زیارۃ نبیک ما رزقتہ اولیائک واھل طاعتک

واغفرلی وارحمنی یا خیر مسئول

الحمد للہ ہر داخلے کا شرف حاصل ہونے پر یہ مبارک دعا برابر پڑھی گئی، آثار تو کہتے ہیں کہ دعا نے اجابت کا شرف پایا۔

بداں را بہ نیکاں بہ بخشد کریم

فالحمد للہ تعالیٰ حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ۔

عجیب حسن اتفاق حضرت پیرو مرشد قدس سرہٗ کے آستانۂ مبارک پر قیام کے آخر وقت میں اظہار کرم فرمایا گیا، عرفات میں، حرم محترم میں، مسجد شریف میں، سفر میں بھی آثار رحمت کا ظہور، آخر مواقع میں زیادہ تر ہوا، جیسا کہ اوپر کے بیان سے واضح ہوا،

حضرت پیرو مرشد قدس سرہٗ کی توجہ مبارک کا متعدد بار ظہور ہوا، اول دہلی کے اسٹیشن پر روانگی جہاز کے وقت جو اوپر بیان ہو چکا، دوسرا مدینہ شریف کی حاضری کے سفر میں ایک منزل پر پہنچکر صبح کو معلوم ہوا کہ حاجی عبدالرشید خاں دواساز رات سے غائب ہیں، خیال ہوا، تلاش کی، پتہ نہ چلا، بہ دوگئے، بے نیل مرام واپس آئے، اب تردد ہوا، حضرت پیرو مرشدگی جانب توجہ کی، تھوڑی دیر کے بعد دیکھا، دواساز آرہے ہیں۔

تیسری مرتبہ، مسجد شریف نبویؐ میں شب بیداری کے وقت، چوتھی مرتبہ، دلی تمنا الملکہ عین تمنا حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدار مبارک سے مشرف ہونے کی تھی، چند مرتبہ حضرت پیرو مرشد

کی جانب توجہ کی، الحمد للہ تعالیٰ سعادت دیدار سے مشرف ہوا اور کس شان سے عاجز نوازی کی گئی، فالحمد للہ تعالیٰ حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ۔

تعمیر مسجد شریف کا تخمینہ یہ بھی آثار سفر مبارک میں سے ایک عظیم الشان اثر ہے، اوپر مذکور ہو چکا ہے کہ حضور نظام نے مسجد شریف کی تعمیری و عمرانی ضروریات کا تخمینہ کرنے کی خدمت میرے سپرد فرمائی تھی، مولوی سید عطا حسین صاحب مہندس ہمراہ گئے تھے، اللہ تعالیٰ نے اس مرحلے کو ہر موقع پر آسان فرمایا، ابن مسعود نے کشادہ پیشانی سے اجازت دی، امیر مدینہ طیبہ کو خط امداد کے واسطے لکھ دیا، امیر ممدوح نے جناب مدیر حرم کو مدد کے لیے مامور فرمایا، جملہ مصارف کا تخمینہ نو لاکھ روپے ہوا، اس تخمینے میں ضروری تعمیر، قالین اور دری کے مصلے، برقی روشنی، آب رسانی وغیرہ شامل تھے، نیز حرم محترم مکہ مکرمہ کی برقی روشنی، بعد حاضری حیدرآباد یہ تخمینہ بارگاہ خسروی میں پیش کیا گیا، حسب ضابطہ باب حکومت سے رائے طلب فرمائی گئی، وہاں سے صرف ایک لاکھ تیس ہزار کی منظوری کی رائے عرض کی گئی، فنانس نے اس سے بھی کم تجویز کی تھی، باقی رقم کی بابت دونوں جگہ سے اختلاف قوت کے ساتھ کیا گیا، مگر بارگاہ خسروی سے پورے نو لاکھ منظور فرمائے گئے، اللہ تعالیٰ حضور نظام کے جاہ و اقبال میں ترقی بخشے اور یہ خدمت قبول فرمائے، ان کے طفیل میں اس عاجز بندے اور مولوی سید عطا حسین صاحب کو بھی نوازے۔

ایک سعادت یہ بھی ہے کہ مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ کے لیے میری سفارش پر حضور نظام نے پچیس ۲۵ ہزار روپئے کلدار منظور فرمائے۔

عرض درود و سلام کا سلسلہ جاری ہے ایک سعادت عظمیٰ یہ بھی للہ الحمد حاصل ہے کہ عاجز بندے کی جانب سے اب بھی روضۂ منورہ کے حضور میں درود و سلام پیش ہوتا رہتا ہے، میرے ماموں صاحب حاجی عبدالکفیل خاں صاحب مقیم مدینہ طیبہ ہیں، از راہ شفقت بزرگانہ موصوف اس سعادت سے

مجھکو بہرہ یاب فرماتے رہتے ہیں، ایک قرابت دار کے ذریعہ سے ہدیۂ درود وسلام مزید قوت نیابت رکھتی ہے، ماموں صاحب مدینہ شریف سے ۲۰ جمادی الآخر ۱۳۴۶ھ کو تحریر کرتے ہیں:-

"آج پچھلی رات کے حصے میں بحضوری حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حاضر تھا، خود بخود میرے دل میں یاد آیا بالوکالۃ آپ کی طرف سے نام لیکر ہدیۂ صلوٰۃ وسلام پیش کرکے لکھ بھیجوں یہ خط لکھا جو رکھا تھا، چنانچہ اطلاع کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔"

دوسرا مکتوب:-

"خوشخبری سنو، کم وبیش ڈیڑھ مہینے تک حرم شریف میں حاضر نہ ہو سکا، بیماری کی وجہ سے، حاضری حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت آپ کی یاد خود بخود میرے دل میں پیدا ہوئی، جب ہدیۂ فاتحہ و درود پیش کرچکا، آپ کی طرف سے میرے دل میں اشارہ ہوا، سورۂ اخلاص اور پڑھو، چنانچہ تین بار وہ بھی آپ کی طرف سے پڑھی گئی۔"

(۷ ذی الحجہ ۱۳۴۶ھ)

فالحمد للہ تعالیٰ حمداً طیباً کثیراً مبارکاً فیہ۔ تم بالخیر

حبیب الرحمٰن

حبیب گنج ضلع علی گڑھ، ۱۶ رمضان المبارک ۱۳۴۷ھ یوم مبارک جمعہ

متفرقات

شب جمعہ، ۱۴ شوال المکرم ۱۳۴۶ھ بمقام حیدرآباد۔

میں نے خواب میں دیکھا کہ مدینہ منورہ میں حاضر ہوکر ایک مکان میں تازہ وارد ہوں، دل اس مسرت سے باغ باغ ہے کہ دوبارہ حاضری نصیب ہوئی، نفیس دولہن نے اسی شب میں یہ خواب دیکھا کہ بڑی راستے سے اونٹوں پر مکہ مکرمہ کا سفر ہم سب طے کر رہے ہیں، ان خوابوں

کی بابت یہ واقعہ قابل لحاظ ہے کہ اس شب سے پہلے پنجشنبہ کی شام کو میرا اور نواب مہدی یار جنگ بہادر کا ان وقتوں کے متعلق باہم مشورہ ہوا تھا جو حکومت حجاز کے ایک مراسلہ کے مضمون سے مسجد شریف نبوی کی تعمیر میں پیش آگئی ہیں، حاضری مدینہ منورہ وسفر مکہ مکرمہ اور وفور مسرت دل کیا عجب ہے کہ کامیابی ورفع مشکل کی بشارات ہوں۔

کل شب کو مولوی میر فیض الرحمٰن صاحب عہدیدار ناظم ال نے رحلت کی، اللھم اغفرلہ وارحمہ۔ مرحوم بمبئی سے مکہ مکرمہ تک سفر حج میں رفیق تھے، اور اچھے رفیق، میری علالت کی وجہ سے مدینہ طیبہ پہلے چلے گئے تھے، حاضری پر اس مبارک بقعہ میں ملاقات ہوئی تو لپٹ کر فرط محبت سے بہت روئے، ان کا عزم سفر حج میرے سفر کے اعلام میں شامل ہوسکتا ہے، اس لیے یہاں تحریر ہوتا ہے،

جب میرا ارادہ حج کا مصمم ہوگیا، سرکار سے اجازت مل گئی تو مولوی صاحب ملاقات کو آئے، اثنائے کلام میں کہا کہ چار مہینے کی رخصت میں نے بھی لی ہے، میں نے سبب رخصت دریافت کیا، کہا استحقاق تھا، کام کرتے کرتے تھک گیا ہوں، آرام کے خیال سے ادھر ادھر جاؤں گا، میں نے کہا کچھ اور رخصت لیکر عزم حج کر دیجئے، رفاقت ہو، چونکہ دفعۃً یہ صورت پیش ہوئی، کہا سامان وغیرہ نہیں کس طرح ہوسکتا ہے مکرر کہا، چلتے وقت میں نے کہا غور کرلیجئے، اب اتنا اثر ہوگیا تھا کہ غور کرنے کا وعدہ کیا، غالباً تیسرے روز آئے اور ہنستے ہوئے آئے، کہا کہ ارادہ مصمم ہوگیا، چار دوستوں کو اور آمادہ کرلیا ہے، ان میں ایک سلیمان مرحوم وکیل بھی تھے، چنانچہ مولوی صاحب مع بی بی اور چاروں رفقا کے بمبئی آکر شریک قافلہ ہوگئے، اس طرح ان کے ارادہ سے وہ خود اور نو اور جملہ دس اہل ایمان سعادت حج سے مشرف ہوگئے، اللہ تعالیٰ مرحوموں کو آخرت کی نعمت بخشے، زندوں کو عافیت وسعادت مزید۔

(۱۹ شوال المکرم ۱۳۴۶ھ چہار شنبہ)

منجملہ آثار ایک واردات قلبیہ | گذشتہ رمضان المبارک ۴۷ کے آخری تاریخوں میں سے ایک روز صبح کو

حسب معمول باغ میں ٹہل رہا تھا، اور اد سے فارغ ہوچکا تھا، لالے کا ایک پھول نو شگفتہ نظر آیا، اسکی رعنائی و شادابی نگاہ میں کھب گئی، دیر تک دیکھتا رہا، جتنا دیکھا اسی قدر نیا انداز رعنائی پیدا ہوتا گیا، بقول مرزا داغ ، ع

اک نیا انداز پیدا ہوگا، جتنا دیکھئے

جب اس کی تابش نے دل کو مبہوت سا کر دیا تو تعجب ہوا کہ کس قدر رنگینی و دل آویزی اس پھول میں ہے، ع

ز سرخی و تری خواہد چکیدن

آفتاب بلند ہوچکا تھا، خیال ہوا نور آفتاب پھول کی تابش کو ترقی دے رہا ہے، اس خیال کے آتے ہی خیال آیا، اپنا بھی آفتاب ہے، اس خیال کے آتے ہی روضۂ مبارک کے گنبد خضرا کا تصور بندھا، اور پھول کی طرح قلب کو اس آفتاب انوار سعادت کے مقابل پایا، ایک کیف رقت پیدا ہوا، پھر اپنے ہی قلب کی سیر تھی، لالہ غائب ہوگیا، دیر تک یہ عالم رہا، فالحمد للہ تعالیٰ علیہا۔

ایک خواب

یوم الخمیس، ۱۹ر جمادی الآخر ۱۳۴۷ھ حیدر آباد، پچھلی شب کو خواب دیکھا، ایک میدان ہے اور بڑے بڑے درختوں کا باغ ہے، باغ کے ایک جانب میدان میں ایسا سماں ہے، جیسا حکام کے دورے کا ہوتا ہے، خیمے ہیں، بڑی سی میز ہے، اس کے ادھر اُدھر کرسیاں ہیں، متعلقین ہیں، میز کے صدر میں کوئی افسر ہیں، جو امتحان لیتے ہیں، ایک پہلو سے دو کرسیاں، دوسرے پہلو پر بھی کرسیاں ہیں، ایک جانب میں ہوں، میرے برابر کی کرسی پر حضرت آدم علیہ السلام تشریف فرما ہیں، سامنے کی ایک کرسی پر مولانا سید سلیمان اشرف صاحب ہیں، دوسری پر مولوی سید زین الدین صاحب، طالب علم دینیات کا امتحان دینے ایک ایک کرکے آتے ہیں، میز پر کھڑے ہوکر سوالوں کا جواب دیتے ہیں،

ممتحن حاکم کون ہیں یہ خیال میں نہیں، ان کا دیکھنا بھی یاد نہیں، اسی اثنا میں ایک خوبصورت نوجوان گورے چٹے تندرست امتحان دینے کے لیے میز کے کنارے آئے، اوپر جانا چاہتے تھے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے ان کو روک کر مسرت و محبت کے لہجے میں فرمایا کہ پہلے مجھکو پیار تو کر لینے دو، خدا کا شکر ہے کہ اب بھی میری اولاد میں ایسے دیندار بچے موجود ہیں، یہ کہکر خوب ان کو پیار کیا، اسکے بعد مولوی سید سلیمان اشرف صاحب اور مولوی سید زین الدین صاحب رخصت ہوکر چلے، میں بھی رخصت کرنے کو چلا، باغ کی دوسری جانب ایک چھوٹے خیمے میں چاؤ ناشتہ کا اہتمام تھا، قصد یہ ہوا کہ جانے سے پہلے دونوں صاحبوں کو چاء پلوا دیجائے، باغ کے اندر داخل ہوئے تو وہ دونوں صاحب تو آگے بڑھ گئے، میں پیچھے رہ گیا، دیکھا کہ دو چیتے پلے ہوئے ہیں، جیسے آجکل یہاں سرکار میں شکار کے لیے تیار کیے جاتے ہیں، ایک ذرا بڑا اور بھاری ہے، وہ تو زنجیر میں بندھا ہوا ہے، ایک ذرا اس سے جسم میں ہلکا ہے وہ کھلا پھرتا ہے، میرے پہنچنے پر میرے پاس آیا، گزر گیا، دوسری مرتبہ آیا، ذرا گھور کے مجھکو دیکھا، اس کا میں نے خیال نہیں کیا، اس نے میری بائیں جانب میری آنکھ کو دیکھا، جو سرخ تھی، اب مجھکو ایسا خیال ہوا کہ مبادا حملہ کرے، اب اس نے اور زیادہ نگاہ جما کر دیکھا اور اس کی وحشت کے آثار نمایاں ہوئے، اس وقت تردد ہوا کہ حملہ کرنے والا ہے، اس کے تربیت کرنے والوں میں سے کوئی سامنے نہ تھا، آواز دینے میں خیال ہوتا تھا کہ آواز سنتے ہی حملہ کر بیٹھے گا، اس کی وحشت میرے تردد کو ترقی دے رہی تھی کہ ایک چھوکرا دوہرے جسم کا پتلی سی سانٹھ لیے نمودار ہوا، سانٹھ کو زور سے زمین پر مار کر للکارا، چیتا ڈر کر بھاگ گیا، میں بہ اطمینان دونوں مہمانوں کی جانب دوسری جانب بڑھا، اس عرصے میں آنکھ کھل گئی،

خواب بمقام اعظم گڈھ دار المصنفین

شب ۱۲ر شعبان روز جمعہ پچھلا پہر، بمبئی میں ہوں، سمندر کا وہ کنارہ جہاں سے جہاز

سوار ہوتے ہیں، ایک موٹر میں چند احباب کنارۂ مذکور دیکھنے گئے ہیں، انھیں میں حاجی محمد اسحاق خاں صاحب رئیس جہانگیر آباد بھی ہیں، میں بھی ہوں، موٹر سمندر کے رخ سڑک پر کھڑی ہے، سڑک بلند اور سپید ہے، سامنے گھونگھٹ کی دیوار ہے، دائیں بائیں اس میں ایک ایک دروازہ ہے، بائیں دروازہ حاجیوں کے جانے کا ہے، میرے قلب پر رقت طاری ہے اور آنسوؤں کا تار آنکھ سے بندھا ہوا ہے، نواب صاحب موصوف میری طرف ٹکٹکی لگائے دیکھ رہے ہیں، تھوڑے توقف سے دیکھا، مدینہ منورہ میں آستانۂ نبوت پر حاضر ہوں، مزاج اقدس کسلمند ہے، کاشانۂ نبوت میں رونق افروز ہیں، میں باہر اجرائے احکامِ اسلام کے لیے عمال اطراف میں بھیج رہا ہوں، یہ دیکھ کر آنکھ کھل گئی،

جمعہ کے وقت مسجد دار المصنفین نو تعمیر (معمرۂ نواب سر محمد مزمل اللہ خاں صاحب) کا افتتاح ہوا، میں نے نماز پڑھائی، آیۂ انما یعمر مساجد اللہ الخ کا بعد نماز بیان کیا، اعظم گڈھ اسی لیے گیا تھا، دل میں خیال تھا کہ مقبولیتِ مسجد کا اشارہ پایا،

جذباتِ عقیدت

از قاضی فدا حسین صاحب ایڈیٹر (بیربھائی)

در حبیب سے لائے حبیب دارو ئے دل — یقین کیجئے آسان ہو گی ہر مشکل

تاریخ مراجعت سفر حج بہنگام ملاقات از شاہ سید ابراہیم صاحب خلیل مارہروی بداہتۂ فرمودند

چہ مبارک و خجستہ
۱۳۴۵ھ

مصرعہا بر تاریخ مذکور

آمد ز حرم حبیب رحمٰن — گل چیدہ ز فضل دستہ دستہ

پیوستہ بہ بزم قدسِ وحدت — پیوند ز ما سوا گسستہ

در دیدہ ز خاک طیبہ توڑے — نقشِ کرمش بجاں نشستہ

تاریخ مراجعت خلیلم — گفتہ "چہ مبارک و خجستہ"
۱۳۴۵ھ

تحریر مدیر اخبار صحیفہ حیدرآباد

۵ اربیع الاول ۱۳۴۵ھ — صحیفہ نگر، پل چادرگھاٹ

عالیجناب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

سرزمین تقدس آئین حجاز سے بعد فریضۂ حج و زیارت مقامات مقدسہ مع الخیر والعافیہ مراجعت فرمائے ہند ہونے پر اس نیاز نامہ کے ذریعہ سے تبریک و تہنیت پیش کیجاتی ہے اور تمنا ہے کہ اس سعادت سے ہم دردمند بھی جلد بہرہ اندوز ہوں جو ابتک محروم ہیں،

جناب والا کے عزیمت افروز حجاز ہوتے وقت ملاقات نہ ہو سکنے کا قلق رہا، شاید اسی کا اثر ہوگا کہ ایک خاص ملاقات عالم رویا میں نصیب ہوئی، غالباً ماہ صفر المظفر کی، ا تاریخ تھی لیکن یہ بخوبی یاد ہے کہ صبح جو نکلنے والی تھی وہ جمعہ کی تھی، شب کے ساڑھے چار بجے کا وقت تھا، خواب میں جناب کو دیکھا کہ ایک بلند مقام پر ایک منبر پر اسی طرح ایستادہ ہیں جس طرح ٹاؤن ہال میں تقریر فرمائی تھی، انداز یہی ہے کہ میلاد پر تقریر فرما کے فارغ ہو چکے ہیں، اس کے بعد مجھ سے خطاب کیا ہے کہ بیان کرو، میں نے بلند آہنگی سے یہ آیۂ کریمہ پڑھی، الحمد للہ الذی ھدانا لھذا وما کنا لنھتدی لولا ان ھدانا اللہ۔

ٹھیک یاد نہیں کہ میں نے اس آیت کو دوسری اور تیسری مرتبہ بھی پڑھا یا نہیں لیکن ایک مرتبہ بہت صاف و واضح پڑھکر سنایا، اتنے میں بیدار ہو گیا، چونکہ خواب معرکہ کا تھا، بالکلیہ محفوظ رہ گیا، تذکرۃ الحبیب کی مہم مثل سابق پیش نظر ہے، گوناگوں مصروفیتوں کا ایک حصہ اب کچھ کچھ

اختتام کو پہنچ رہا ہے، اس کے بعد عون ایزدی سے توقع ہے کہ اس قابل ہو سکوں کہ جو تقریریں تا حال حافظہ میں ہیں وہ کاغذ پر آجائیں، اس کے بعد طباعت شروع کرادی جائے، فقط

خاکسار محمد اکبر علی، مدیر اخبار صحیفہ حیدرآباد دکن

مخدومنا المعظم ومطاعنا المحترم صاحب الفضل والمجد والکرم زید مجدہم السامی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ جزاکم اللہ وتقبل اللہ منکم

اس وقت یہ یادداشت پیش نظر ہے، اور آج سے دو برس قبل وہ سماں پیش نظر تھا، جو انتہائی سکون اور غایت فراغ قلب کا ایک سچا نمونہ تھا، فارسی کا ایک شعر ہے ؎

بگیر ترک تعلق دلا ز مرغابی میان آب چو برخاست خشک پر برخاست

اس کا صحیح مصداق جیسا کہ میں نے آپ کے سفر حجاز کو پایا، ایسی دوسری مثال میری آنکھوں نے نہیں دیکھی، بعض اہل اللہ کی زیارت کا شرف حاصل ہوا ہے، لیکن ان کی جناب میں دنیا کو کہیں جگہ نہیں دی گئی تھی، وہ تھے اور خدا کی یاد تھی، عبادت کا سرمایہ تھا، فکر و مراقبہ کی سلطنت تھی، وجد و سرور کا خزانہ تھا، جب اس عالم سے کوچ کا وقت آیا تو اپنی سلطنت اپنا خزانہ اپنے ساتھ لیتے گئے اور خلفھم اجر غیر ممنون کا نقشہ دکھا گئے، لیکن اس مشاہدہ سے کہ تیغ در گل زدہ ام، در دل آنکھیں محروم تھیں، الحمد للہ کہ آپ کے سفر نے یہ نظارہ بھی دکھلا دیا، ریاست وسیع، اولاد و احفاد سے گھر مالامال، ایک سلطنت کے رکن رکین، انما اموالکم واولادکم کے قید و سلاسل ہر چہار طرف سے محیط لیکن جب وقت رب جلیل کے بیت عظیم اور آستانۂ رؤف و رحیم صلی اللہ علیہ وسلم کے حاضری کا آیا تو ساری سنگین زنجیریں تار عنکبوت کی طرح ٹوٹ گئیں اور والہانہ شوق جس میں استقامت کا وقار عجیب انداز پیدا کر رہا تھا، اس شان سے لے چلا کہ عیاناً محسوس ہو رہا تھا کہ رحمت الٰہی اپنے لطف خاص کے ساتھ لے جا رہی ہے، بیشک کار اینجا بفضل ست نہ بکسب ؎

این سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

یہ اثر میرے دل پر اس وقت ایسا گہرا ہوا تھا کہ اس کا متعدد مجالس میں میں نے ذکر کیا ہے، اور پھر بھی یاد تازہ ہے،

واردات اور کوائف قلبیہ اس کا یقین دلاتے ہیں کہ حج مبرور اور زیارت مقبول ہوں، فقہاء، محدثین، مشائخ اور صوفیہ نے بھی علامتیں تحریر فرمائی ہیں، کلام پاک سنانا، حدیث مقدس کی اجازت لینا، یہ تحفۂ سرمدی ہے، جو آپ کو عطا ہوا، اسی پاک مقام پر قرآن پاک کا نزول ہے اور اسی مقدس بقعہ سے وحی غیر متلو کی سعادت امت کو حاصل، پھر اب اور کیا چاہیے، خادم بنکر خدمت جاروب کشی کی سعادت حاصل کی اور علم کا خلعت جو عطا ہوا اسے پہنکر تصحیح کلام پاک اور امامت نماز۔ تقبل اللہ منکم ثم تقبل اللہ منکم۔

دل چاہتا تھا کہ جس مسافر پر بعزم سفر کے وقت یہ رحمت کے آثار تھے وہ جب حرمین شریفین زادہما اللہ شرفاً وتعظیماً پہنچکر مہمان خاص ہوا ہوگا تو رحمت و انعام کے کیسے کیسے خلعت پہنے ہوں گے، ذرا ان سے آگاہ ہوتا لیکن حیدرآباد کی مصروفیتوں نے اس کا موقع نہ دیا، سوال کرنے سے ڈرتا تھا، اس لیے کہ محرومیت کی قابلیت نہ تھی، مگر آنجناب کا کرم جسے میں اپنی خوش نصیبی جانتا ہوں ہر موقع پر مجھ بینوا کو یاد رکھتا ہے، اس نے خود ہی بڑھکر حسب معمول یہ تمنا بھی پوری کردی۔ جزاکم اللہ ثم جزاکم اللہ۔

در دانہ کی خدمت اور کیفیت استقلال پڑھ کر دل سے بے ساختہ دعائیں نکلیں، زہے نصیب اس بی بی کے جس سے شوہر ایسا خوش ہوا اور جس کو ایسی مبارک سرزمین پر ایسی خدمت اور راحت رسانی کی سعادت حاصل ہو، ربنا تقبل منھا

حضرت مولانا گنج مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ کو ایک خاص نسبت حضرت سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے تھی، یہ اسی نسبت کا پرتو تھا جو مزار اقدس پر حاضری کے وقت آپ پر وارد ہوا،

گھوڑا اعمال صالحہ اور عقیدت حسنہ ہے، اس کی رفتار بناؤ سنوار عمل کی صداقت اور عقیدہ کی رزانت ہے، بیعت آپ کی سلسلۂ عالیہ نقشبندیہ میں ہے، اس لیے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا ایک طرف اور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا دوسری طرف ہونا نسبتِ محمدی اور نسبتِ صدیقی کا جلوہ ہے۔

الحمد للہ دو مرتبہ اس یادداشت مسمی بہ "فوز عظیم" کو اس وقت تک پڑھ چکا ہوں، ہر بار ایک نیا لطف دل نے محسوس کیا، باوجود تاریکی قلب آپ کے پردرد جوش عقیدت میں ڈوبے ہوئے جملے کیفیت پر کیفیت پیدا کرتے گئے۔ میں انداز تحریر سے یوں خوش ہوں کہ حال قال میں پوری طرح جلوہ نما ہے، جزاکم اللہ وتقبل اللہ منکم۔ زیادہ اللہ بس و باقی ہوس۔

حررہ بقلمہ

فقیر محمد سلیمان اشرف عفی عنہ

۲۷ رمضان المبارک ۱۳۴۶ھ۔ شب دو شنبہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ کہ بعنایات و برکات خاتم الرسل رحمۃ للعلمین، امام الانبیاء والمرسلین صلی اللہ علیہ وسلم آج بتاریخ ۱۰ ذوالقعدہ ۱۳۴۶ھ اس "فوز عظیم" کی دید اور مطالعہ، آثار و ثمرات سے مستفیض ہونے کا موقع اس عبد خاطی کو ملا جس کی پینتیس ۳۵ سالہ زندگی غالباً صرف خیانتوں میں بسر ہوئی، رب اغفر لی وتب علی، انک انت التواب الرحیم۔

اس کتاب نے یا چند اوراق نے جو اپنے انتساب کی بدولت قدسی مآب ہو چکے ہیں، مجھ پر کیا اثر ڈالا، اسے قلمبند کرتا ہوں، واللہ علی ما نقول شہید۔ لیعبدوا اللہ مخلصین لہ الدین کی تفسیر ناطق کے دیکھنے کا موقع ملا۔ یہدی الیہ من ینیب کے قطعی نتائج، جو قطعی تجربات سے ماخوذ ہیں،

ان کو ایسے قلم سے مکتوب پایا جس کے متعلق میرا وجدانی تجربہ ہے کہ اس کے الفاظ حتی الوسع اپنے معانی کے حدود سے متجاوز نہیں ہوتے، رحمہ اللہ الکاتب المغفور السعید۔ کہ انھوں نے اپنے جنچے تلے احساسات اور مشاہدات و مبشرات کو احتیاط کے ساتھ جمع فرمایا ہے، اغراق و غلو سے پاک، وساوس و خطرات نفسانی سے مصفا واردات کا یہ مجموعہ ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زندہ خالق رحمٰن کی جستجو ناکام نہیں ہوتی، بیت اللہ کے داخلہ کا احساس اور روضۂ مطہرہ مقدسہ میں خادموں کے ساتھ اسی حیثیت کے ساتھ داخل ہونا جس حیثیت سے ایک امت مرحومہ کے ایک فرد مرحوم کو داخل ہونا چاہیے، اور اس کے بعد تمام ذہنی تغیرات کی تحلیل کے بعد بھی غیر اختیاری سکون کی یافت، دلیل ہے کہ انسانی روح صرف کسی کے خیال اور دھیان سے نہیں، بلکہ مطلوب کی قرب واقعی و نفس الامری سے اسی طمانیت کو حاصل کرتی ہے جو تصور و خیال کے نتائج سے قطعاً ممتاز ہے، مجھ پر غار حرا کے تاثر کا اثر، عرفات کے تاثر اضطراری سے کم مترتب نہیں ہوا، اور معلوم نہیں کہ جامع اوراق کے بیان کے بعد سے بلکہ اس وقت سے جس وقت انھوں نے اپنی زبان مبارک سے اس حرائی وجدان و ذوق کا تذکرہ کیا ہے، ایک خاص نسبت پیدا ہو گئی ہے، اور اکثر اس کا خیال آتا ہے، عجیب و غریب ہیجانوں کا ایک سلسلہ دل و دماغ میں ہل چل ڈالتا ہے۔

ع۔ خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

بہر حال مبارک ہے وہ شخص جس کو اجمیر کی شہادت میں بسطۃ کی بشارت سنائی گئی، جس کے دل پر فضل رحمانی توجہات نے لنگر کا کام کیا، اور جس کے لیے اسٹیشن پر خود اس کے پیر و مرشد رحمۃ اللہ علیہ کی امانت آنکھ کھولنے کے ساتھ مجسم ہوئی، اور جس کے لیے نجد کے وحشیوں نے رافت و رحمت کی کرنیں اپنے اندر محسوس کرائیں، اور جس نے عرفات میں وہ دیکھا جو "اخلصوا دینہم للہ" والوں کو دکھایا جاتا ہے، اور جس کی زبان پر اس کے ارادہ و اختیار کو سوخت کر کے خود کریم بنکر آیا،

اور اس سے وہی کہلوایا جس کا وعدہ اپنے اچھوں سے کرتا ہے۔ ولسوف یعطیک ربک فترضیٰ اور جس کے لیے کوثر کے پیمانہ بردار صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے طیبہ کا آب زلال عالم شہادت میں اس احساس کے ساتھ بھیجا کہ پانے والے نے اس کو اسی طرف سے پایا جہاں سے وہ آیا تھا، کتنی قیمتی ہے وہ جاروب [illegible] نواب صدر یار جنگ بہادر آپ نے کس زمین مبارک پر سجدہ ریزی کے لیے چھوڑا ہے، وانت حل بھذا البلد کی قسم وہ کھاتا ہے، جس کی قسم سب کھاتے ہیں مفسرین نے مکہ معظمہ مراد لیا ہو لیکن وصف کا اشتراک، بلکہ اتحاد تخصیص، اس قسم کو کہاں پھیر دیتی ہے، آپ نے ناشر قرآن کا جلال اور امت کی آسانیوں کی اشاعت کرنے والی حقیقت صدیقیہ کو محسوس کیا، عمر بھر جس قرآنی دشت کے کوچہ کی خاک چھانتے رہے آج اس کے سرچشمہ پر پہنچ کر نصیب ہوا۔

الحاصل آپ نے مجاہدہ کیا، شعب ابی طالب کے پاس ہی، آپ پر بھی تین سال کے لیے نہیں بلکہ چند دنوں کے لیے کھانا پینا کسی وجہ سے روکا گیا، تو پھر اس کا شکر کیوں نہیں ادا فرماتے کہ اس گھاٹی میں آپ کی غم خواری بھی اسی حقیقت کے رنگ میں رہی جو ابو طالب کے شعب میں اس کے درجہ کے لحاظ سے غم خواری کر رہی تھی۔ جعل اللہ ما بھا مع ما بھا۔ اس گھاٹی سے نکلنے کے بعد، آپ حرم محمدی علی صاحبہ الف الف سلام وتحیہ سے روانہ ہوئے، اور ٹھیک رات کی تاریکی میں جس میں چاندنی کا نور موج مار رہا تھا، آپ نے اپنے بے قابو نفس کو اپنی رانوں کے نیچے پایا، اسکی چال کا حال براق کے حالات میں پڑھیے، میں کس قدر غبطہ کروں، کس قدر رشک کروں کہ جبریل امین کی جگہ آپ کا عروج اس واسطہ کبریٰ جلیلہ کے ذریعہ سے ہوا، جس سے بڑا واسطہ انسان اور خدا کے درمیان نہ کوئی ہوا نہ ہوگا، آپ نے "صدیقیت" کی اشاعت میں اپنے کو شریک کیا تھا، پھر دیکھا کہ اس کا معاوضہ کس شکل میں ملا، بہت کم دو، اور بہت زیادہ لو، اس کا تماشا کیا عجیب تھا، جن آیات کا مشاہدہ معراج کلی میں ہوا تھا، اسی کا ظہور شہادت میں ہوا کہ آدمیت کے دور سے

گذرتے ہوئے دعائے ابراہیم (صلی اللہ علیہم وسلم) نے ابراہیمی فرض کو ادا کرنے کے بعد اذا جاء نصر اللہ والفتح الآیۃ۔ کی سورہ سنا کر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے سینۂ انور یعنی طوفان غم فراق کے سمندر کو متلاطم کر دیا۔

پھر آل یعقوب کو اگر ولا تیئسوا من روح اللہ کی شہادت سناتے ہوئے کوئی اسماعیلی دیوانہ یہ کہے کہ "جائزہ دلانے" کا ظہور ہونے والا ہے، تو اس اچھی اور پاک امید کا کیوں نہ انتظار کیا جائے، آپ نے غضب کر دیا۔

"ایک سیاہ کار کو اس پیاری رات کی ٹھنڈی چاندنی میں اس کوہستان میں ہاں ان ہی پاک میدانوں میں، جس کے متعلق دل کے کیا کیا ارمان ہیں، اللہ اکبر اس عروج کی حالت میں اپنے دماغ عالی میں جگہ دیدی، جس کا وہ کسی طرح مستحق نہیں تھا، اسی بے شک "نرالے اپنے" پر کیا کیا"

حدیث میں آیا ہے کہ تہلیل و تسبیح حول عرش میں گھومتی ہیں، اور مسبح و مہلل کی یاد دلاتی ہیں، کیا کہوں کہ آپ میرے کیا بن گئے، بس اب آپ اس عبد خاطی کے لیے استغفار کیجیے اور اسی طرح اپنے قلب صافی میں کبھی کبھی گذرنے کی اجازت مرحمت فرمائیے، حدیث میں ہے:

من استغفر للمومنین والمومنات فی کل یوم خمس عشر مرات یرزق بھم

اھل الارض

المستغفر لذنوبہ

مناظر احسن گیلانی

سفرنامۂ مصر و شام و روم

سنہ ۱۸۹۲ء میں علامہ شبلیؒ نے جو سفر کیا تھا، اس کے حالات و واقعات، یہ سفرنامہ اردو میں ممالک اسلامیہ کا سفرنامہ ہے، جس میں ٹرکی، مصر اور شام کے علمی و تعلیمی و تمدنی حالات کی تصویر کھینچی ہے،

ضخامت ۲۲۶ صفحے قیمت: ۔ ۳ روپے

مینیجر

شمالی ہند کے چند علمی و ادبی مراکز

ضلع بریلی (۲)

از

جناب ڈاکٹر محمد ولی الحق صاحب انصاری لکچرار لکھنؤ یونیورسٹی

(۷)

اسی عہد کے بریلی کے ایک اور شاعر مرزا عباس بیگ مرزا نادر کی ندیم کی اولاد میں تھے، مدت تک رامپور میں رہے، پھر لکھنؤ جاکر آتش کے شاگرد ہوگئے، اور ان کے مشورے سے نادر تخلص اختیار کیا، لکھنؤ سے باندہ گئے، اور ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں چالیس سال کی عمر میں بغاوت کے الزام میں پھانسی پائی، اس الزام کا باعث ان کا درج ذیل شعر تھا جس میں انگریزوں کو اپنی توہین نظر آئی تھی۔

اختر جھپک گئے ترے خالوں کے سامنے گوروں کے ہاتھ اٹھ گئے کالوں کے سامنے

منجملہ دیگر تصانیف کے ان کی ایک ایسی مثنوی بھی تھی جس میں انھوں نے فسانۂ عجائب کو لیلیٰ مجنوں کی بحر میں نظم کیا تھا، دیوان بھی مرتب کیا تھا لیکن اس کا پتہ نہیں چلتا[۱]، نمونۂ حسب ذیل اشعار پیش ہیں:-

بدلا ہوا ہے رنگ سیاہی گھٹا کی ہے لا ساقیا شراب کہ رحمت خدا کی ہے

پیتا نہیں شراب کبھی بے وضو کئے قالب میں میرے روح کسی پارسا کی ہے

۱۔ انتخاب یادگار، صفحہ ۲۱۸۔ خمخانۂ جاوید، جلد چہارم، ص ۵۶

باب قبول کہتی ہے جس کو تمام خلق کھڑکی وہ اے صنم تری دولت سرا کی ہے

عباس روز حشر پکارتا اٹھوں گا میں لوٹا مجھے بتوں نے دہائی خدا کی ہے

رائے گنگا پرساد رونق خلف منشی بھوانی پرشاد بریلی کے روسا میں تھے، اور ڈپٹی کلکٹری کے عہدے پر فائز تھے، ان کے دو شعر بطور نمونۂ کلام پیش ہیں[۱]

آغاز میں نہ فکر کی انجام کے لیے چھوڑا خدا کو الفتِ اصنام کے لیے

تو بھی تو کامِ دل کبھی ہوتا نہیں حصول گر جان دیجئے بتِ خود کام کے لیے

پنڈت دیبی پرساد صادق بھی انیسویں صدی کے وسطی زمانہ سے تعلق رکھتے ہیں، تذکرۂ نادر میں ان کے درجِ ذیل اشعار بطور نمونہ ملتے ہیں[۲]

خوف دوزخ کا نہیں اور نہ جنت کی ہوس ہم غرض رکھتے ہیں اس صورت نورانی سے

کیا عجب ہے جو عنایت سے خدا کی صادق بڑھ کے ہو میری غزل سعدی و خاقانی سے

سید عرفان علی عرفان کا ذکر بھی نادر نے اسی عہد کے شاعروں میں کیا ہے، بریلی ان کا وطن تھا، اور وہ خود نواب محمد علی خاں بہادر، رئیس شمس آباد کے لڑکوں کے اتالیق اور متعدد کتابوں کے مصنف تھے[۳]

ان کا ایک شعر پیش ہے،

مہ انور کو کچھ نسبت نہیں ہے روئے جاناں سے ضیا اسکے کف پا میں ہے افزوں ماہ تاباں سے

مولوی محمد بخش نادان کرامت علی شہیدی کے شاگرد تھے اور فن شعر میں کافی دخل رکھتے تھے[۴]

ان کا درج ذیل شعر بطور نمونۂ کلام پیش ہے،

پھر ابھی زنداں ہوا میں بعد رہائی زنجیر میں انداز ہے زلفوں کی رسن کا

میر محمد حسین فرحت سعادت علی عیش خلف میر غلام علی عشرت کے بیٹے اور شاگرد تھے، اور سلسلۂ ملازمت

۱۔ تذکرۂ نادر، ص ۴۴، ۲۔ ایضاً ص ۵۰، ۳۔ ایضاً ص ۹۵ ۴۔ ایضاً ص ۱۱۰، ۵۔ سخن شعرا، ص ۴۸۰

رامپور میں مقیم تھے[1]، نمونۂ کلام درج ذیل اشعار ہیں.

زاہد خشک کا رونا دیکھو　　گھر میں خاک اڑتی ہے باہر برسات

تم بھی الٹ دو منہ سے مری جاں نقاب کو　　کھل کھل کے گل دکھاتے ہیں جوبن بہار میں

لطف علی خاں لطف بریلوی بھی اسی دور کے ایک نعت گو شاعر تھے، اور نعت کے ایک دیوان کے مصنف ہیں[2]، ذیل کے چند اشعار ان کے کلام کا نمونہ ہیں

اچھا نہ ہو یارب کبھی بیمارِ محمدؐ　　کم ہو نہ کبھی خواہشِ دیدارِ محمدؐ

مومن ہوا جس نے کیا اقرارِ محمدؐ　　کافر ہوا جس نے کیا انکارِ محمدؐ

ہے سر میں ازل سے سرِ سودائے محمدؐ　　ہے دل میں خیالِ رخِ زیبائے محمدؐ

سید مہربان علی مہر بھی اسی عہد کے ایک دوسرے نعت گو شاعر تھے، بریلی کے باشندے لیکن دربار رامپور سے وابستہ تھے، اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے[3]، انکے کلام کا نمونہ درج ذیل اشعار ہیں:

من زلیخائے جمال دیگرم　　یوسف من یوسف بازار نیست

گل جس کو لوگ کہتے ہیں ہے آپ کا عرق　　کہتے ہیں جس کو عطر وہ ہے بوئے مصطفیٰ

نواب بہادر خاں ولد نواب ذوالفقار خاں بن حافظ رحمت خاں مقرون تخلص کرتے تھے، صاحب دیوان شاعر تھے، نمونۂ درج ذیل شعر پیش ہے:

تا حشر اب خیال نہ میرا کریگا دل　　تو اس کو مل گیا تو مجھے کیا کریگا دل

حافظ رحمت خاں کے ایک اور پوتے حافظ محمد عبدالعزیز خاں عزیز ابن محمد سعادت یار خاں ابن محمد یار خاں بھی اسی دور کے بریلوی شاعر اور صاحب دیوان تھے، ۴۰۶ صفحات پر مشتمل ان کا مجموعۂ کلام ۱۳۱۱ھ میں انکی وفات کے دو سال کے بعد شائع ہوگیا تھا، انھوں نے ملا حسن کاشی کے ہفت بند

لہ انتخاب یادگار ص ۲۰۲ ؂ سخن شعراء ص ۵۰۴ ؂ انتخاب یادگار ص ۳۰۷

کا ہفت کوکب کے عنوان سے اردو نظم میں ترجمہ بھی کیا تھا، ان کی یہ نظم بھی ۱۳۰۹ھ میں شائع ہوگئی تھی[1]، عزیز کے دو شعر بطور نمونہ پیش ہیں:

نوش جاں جب مئے خمخانۂ وحدت ہوگی　　شیخ میخانہ میں کعبہ کی زیارت ہوگی

نام رکھیں گے وہ ہم لیں گے اگر نام جفا　　بات شکوے کی کہیں گے تو شکایت ہوگی

جولان ایک آزاد منش وارستہ مزاج درویش تھے، جن کا وطن بدایوں تھا لیکن مسکن بریلی تھا، آتش لکھنوی کے شاگرد تھے، فقر اختیار کرنے کے بعد سیاحی میں زندگی گزار دی یہاں تک کہ ۱۲۸۲ھ مطابق ۱۸۶۶ء میں وفات پائی[2]، نمونۂ کلام پیش ہے:

کیا بتائیں کہ ہے کہاں مسکن　　کوئے قاتل میں رہا کرتے ہیں

معشوق پر بھی ہوتی ہے تاثیر جاہ کی　　چٹکی کلی جو بلبل بیدل نے آہ کی

ترکِ الفت میں بھی منہ تجھ سے نہ موڑا میں نے　　آنا جانا ترے کوچے میں نہ چھوڑا میں نے

خاک سے واں کے ہوا چشمۂ زمزم پیدا　　جس جگہ دامن تر اپنا نچوڑا میں نے

سید ولایت علی متین مولوی غلام نجف کے شاگرد اور اسی عہد کے بریلی کے ایک شاعر تھے. ان کے دو شعر بطور نمونۂ کلام پیش ہیں[3]:

ناز و ادا کرشمہ تکلم ہے بات ہے　　شکر خدا کہ اب نظر التفات ہے

اب وصال یار پہ ہوتے تو بار یاب　　پر کیا کریں کہ پاؤں میں بند حیات ہے

سید نجم الدین احمد نجم بریلی کے باشندے اور پرگنہ تروا کے تحصیلدار تھے، ان کے دو شعر پیش ہیں[4]

سنا ہے اٹھ گیا دنیا سے وہ آج　　گرایا کل جسے تم نے نظر سے

کسے ہے نجم دل دینے سے انکار　　وہ مانگیں تو تلطف کی نظر سے

لہ تذکرہ نادر ص ۱۱۱ ؂ خمخانۂ جاوید، ج ۲ ص ۲۹۶ ؂ تذکرۂ نادر ص ۱۳۶ ؂ ایضاً ص ۱۶۰

حکیم سید نادر حسین خاں نوؔر بریلی کے رئیس اور صاحب دیوان شاعر تھے، انکے دو شعر درج ذیل ہیں[1]:

بعد مردن بھی کسی سے نہیں نیکی کی امید   خاک میں مجھ کو ملانے کو احبا آئے

چاند کی طرح نہ انگشت نما ہوں یا رب   دامن خاک میں چھپ جاؤں جو دھبا آئے

شیخ امداد علی یاؔور شہیدی کے شاگرد اور بریلی کے باشندے تھے، لیکن آبائی وطن لکھنؤ تھا، صاحب دیوان شاعر گذرے ہیں، چند شعر نمونۃً پیش ہیں[2]،

اس آہ نارسا نے کلیجہ پکا دیا   اس گل کے کان تک نہ گئے نالہائے دل

ہوا ہے دفن دل بیقرار پہلو میں   بنا ہے کشتۂ غم کا مزار پہلو میں

کون ہوتا ہے برے وقت میں اپنا یاؔور   مرد وہ ہیں جو مصیبت میں خبر لیتے ہیں

سید اکبر علی تمیزؔ بریلوی عارؔ شور علی صاحب کے شاگرد تھے، اور ۱۲۷۷ھ (مطابق ۱۸۶۰ء) میں شائع ہونے والے رسائل میں ان کا کلام چھپا کرتا تھا[3]، نمونۂ کلام درج ذیل ہے،

دم نہیں باقی ہے چشم طالب دیدار میں   ہے ضیائے طور کس کے شعلۂ رخسار میں

لے بتوں سے گر خون کردگار رہے   وہ آدمی ہے جو غفلت میں ہوشیار رہے

بتوں کے حکم کی تعمیل کب ہوئی ہم سے   ستم یہ ہے کہ خدا سے بھی شرمسار رہے

منشی غلام اللہ (یا بقول مالک رام شاکر علی) بسمؔل بریلوی خلف منشی سرفراز علی ۱۸۲۳ء کے قریب میرٹھ میں پیدا ہوئے، تعلیم مارہرہ اور بریلی میں پائی، مدتوں مارہرہ اور میرٹھ میں ناظر عدالت رہے، پنشن لینے کے بعد مستقلاً بریلی میں مقیم رہے، اور وہیں ۱۸۹۸ء میں وفات پائی، غالب کے شاگرد تھے[4]، اور ان ہی کے رنگ میں کہنے کی کوشش کرتے تھے، آخر عمر میں نعت گوئی سے زیادہ شغف ہوگیا تھا[5]، ان کی ایک مسلسل غزل کے چند شعر پیش ہیں،

۱؎ تذکرۂ نادر ص ۱۷۰، ۲؎ سخن شعرا ص ۵۶۰ ۳؎ خمخانۂ جاوید ج ۲ ص ۱۳۰ ۴؎ ایضاً ج ۱ ص ۵۹۰، تلامذۂ غالب، ص ۴۴

شب وفور اشک سے گردوں کف سیلاب تھا   دورۂ چشم کواکب حلقۂ گرداب تھا

واں حنا بندی عنان گیر خرام ناز تھی   یاں تن کاہیدہ غرق اشک خوناب تھا

واں رخ پرنور تھا صبح امید زندگی   یاں ہر اک داغ جگر خورشید عالمتاب تھا

واں نگاہ سرمہ آلودہ بھی گلچین بہار   موجزن یاں چشم تر سے خون کا سیلاب تھا

یاں دل شوریدہ کو سر پھوڑنے کا تھا خیال   زیر سر واں غیر کا زانو برائے خواب تھا

حسن تمکیں آزما کو پاس خودداری ادھر   خانہ زاد عشق کو ملحوظ یاں آداب تھا

ان کو پاس ننگ دامنگیر مجھکو پاس وضع   وہ ادھر بیتاب تھے اور میں ادھر بیتاب تھا

جلوۂ مل اب کہاں وہ شور قلقل اب کہاں   نغمۂ بلبل فسانہ جلوۂ گل خواب تھا

میں نے دیکھا رات بسمؔل کو پڑا تھا خاک پر   بستر سنجاب نے بالش کمخواب تھا

اسی عہد میں بسمؔل تخلص کے ایک دوسرے شاعر محمد یار خاں بریلوی تھے جن کا ایک مجموعۂ کلام نوحۂ بسمؔل ۱۲۶۵ھ میں شائع ہوا تھا،

سید رحمت اللہ جنوؔن بریلوی حکیم نیاز احمد خاں ہوشؔ کے شاگرد تھے، ۱۸۸۲ء تک حیات تھے، شعر خوب کہتے تھے اور بریلی کے مشاعروں کی جان سمجھے جاتے تھے[1]، انکے چند شعر درج ذیل ہیں:

دید کے قابل ہے رحم ان کا کہ وقت نزع وہ   پانی ٹپکاتے ہیں میرے حلق میں تلوار کا

مرگ کے بعد ہوا خانۂ تربت پر نور   شمع کا کام کیا داغ نے روشن ہو کر

عشق نے برباد کردی حسن کی دولت جنوں   کوڑیوں کے مول یوسف بک گیا بازار میں

بعد مردن بھی اگر آوارگی یوں ہی رہی   خاک اپنی دیکھئے کس کس کے دامنگیر ہو

فنا کے بعد پریشانیاں نہ اپنی گئیں   ہوا چمن میں رہے دشت میں غبار رہے

وہ چشم مست سے دیکھے کبھی جو ایک نظر   تو میں تو کیا ہوں کہ زاہد کو بھی خمار آئے

۱؎ خمخانۂ جاوید، جلد دوم ص ۲۷۳

جنون تخلص بریلی کے ایک دوسرے شاعر قاضی عبد الجلیل تھے، ان کے اجداد میں قاضی ثناء اللہ، شجاع الدولہ کے معتمد تھے، خود عبد الجلیل ۱۲۵۱ھ (مطابق ۱۸۳۵ء) میں پیدا ہوئے اور اٹھارہ برس کی عمر میں عربی فارسی کی تعلیم مکمل کی، مرزا غالب کے چہیتے شاگرد تھے، اور خود فن تاریخ گوئی میں کمال رکھتے تھے، ۱۸۹۰ء میں وہ خاں بہادر کے خطاب سے سرفراز ہوئے اور ۱۹۱۰ء میں وفات پائی، کلام ان کا بہت تھا، مگر افسوس کہ انھوں نے خود اسے تلف کر دیا[1]، انکے کلام کا نمونہ درج ذیل اشعار ہیں

دیکھ کر اس بت کو کیا کہیے کہ کیا یاد آگیا
ہم کو اس کی بے وفائی سے خدا یاد آگیا

میں جو رخصت ہو کے ان سے پھر گیا تو یوں کہا
کیوں گئے کیوں آئے کیا بھولے تھے کیا یاد آگیا

سامنے سے یوں نکل جاتے ہیں وہ
ان سے گویا کچھ شناسائی نہیں

یہی لطف و عنایت ستم و جور ہی ہو
غم تو یہ ہے کہ نہیں حال کا پرساں کوئی

کہاں یہ تاب کہ آنکھیں ملا سکوں تجھ سے
کہ اک نظر میں دگرگوں ہے حال محفل کا

ہے ہجر شام ہی سے بھاری رات
ہائے کیسے کٹے گی ساری رات

انھوں نے آئینہ دیکھا تو میں نے منہ ان کا
حواس و ہوش بجا ہاں نہیں تو یاں بھی نہیں

ہجر میں کون تھا ہمدرد
کچھ ترے غم نے غمگساری کی

مولوی احسن بھوا بھی انیسویں صدی کے آخری عہد کے ایک بریلوی شاعر ہیں، وہ اسیر کے شاگرد تھے[2]، ان کے چند شعر پیش ہیں،

روتے ہیں اپنے حال شکستہ پہ صبح تک
منہ ڈھانکتے ہیں دامن چاک سحر سے ہم

آنکھوں سے دل میں کھینچتے ہیں عکس روئے یار
رفو کا کام لیتے ہیں تار نظر سے ہم

رخ میری سمت اور نگاہ لطف غیر پر
اپنی نظر میں گر گئے ان کی نظر سے ہم

[1] خمخانۂ جاوید جلد دوم ص ۱۵، [2] ایضاً ج ۳ ص ۴۰۰

رہا راز محبت سوز پنہاں میں نہاں برسوں
کیے اسرار دل رنگ پریدہ نے عیاں برسوں

بنا یہ جسم خاکی مرکز جاں مدتوں رسوا
چلی ریگ رواں میں کشتی عمر رواں برسوں

رسوا کے معاصرین میں شیخ محمد علی حسین طالب اور کفایت اللہ بریلوی بھی تھے، طالب کا مجموعہ کلام موسوم بہ مدح مرغوب ۱۳۰۱ھ میں اور آخر الذکر کا دیوان موسوم بہ بہار خلد ۱۸۸۸ء میں شائع ہوا،

حکیم برجموہن لال خمار بریلوی، نیاز احمد خاں ہوش کے شاگرد تھے، ۱۸۷۰ء تک حیات تھے، بعد کے حالات کا پتہ نہیں چلتا[1]، ان کے کلام کا نمونہ درج ذیل اشعار ہیں،

تاسف کیا کریں ہم سر کے جانے کا بھلا قاتل
چلو اچھا ہوا گردن سے اپنی بار سر سرکا

اے شیخ جا کے بزم میں اس مے پرست کی
دیکھوں گا میں کہ کس طرح ہشیار جائیگا

لکھنؤ کیوں نہ بریلی کو کہیں ان روزوں
اب تو سرسبز یہاں باغ سخن دیکھتے ہیں

ہو اسیر و ہوش کی جب پر عنایت اے خمار
کیوں نہ پھر اسکی زمین شعر میں جاگیر ہو

شیخ حامد حسین خاں حامد کمبوہ بریلی میں حضرت ہوش کے ایک دوسرے شاگرد تھے اور ۱۸۷۰ء کے مشاعروں میں شریک ہوا کرتے تھے[2]، نمونۂ کلام یہ ہے:

بلبل کی قید کا اسے اس دن کھلے گا حال
صیاد جب بلا میں گرفتار آئے گا

ہوا ہوں حسرت دیدار میں عجب کیا ہے
جو بعد مرگ بھی وا چشم انتظار رہے

کسی طرح مٹتی نہیں دل سے یہ
محبت بھی داغ جگر ہو گئی

عبادت کی اے شیخ یا پی شراب
یہ عمر دو روزہ بسر ہو گئی

دہن سانپ کا موتیوں سے بھرا
پسینہ میں کاکل جو تر ہو گئی

میر شجاعت علی خستہ اسی زمانہ کے بریلی کے ایک ظریف شاعر تھے، ۱۸۷۵ء تک زندہ تھے،

[1] خمخانۂ جاوید ج سوم ص ۵۲ [2] ایضاً ج ۲ ص ۳۷۱

ان کے حالات کا پتہ نہیں چلتا[1]، نمونۂ کلام درج ذیل ہے،

ایک سے ایک شب ہجر میں بڑھکر آیا | کبھی پسو کبھی کھٹمل کبھی مچھر آیا

پھوس سے یار کو جاڑے میں تپایا شب وصل | کام آخر مرا ٹوٹا ہوا چھپر آیا

مرا رقیب الٰہی ذلیل و خوار رہے | گلے میں ٹوٹی ہوئی جوتیوں کا ہار رہے

جو شعر غیر کو اپنا بنا کے پڑھتا ہے | چھپے ہزار وہ لیکن مری نگاہ میں ہے

قاسم علی خواہاں ۱۲۶۴ھ (مطابق ۱۸۴۸ء) میں بریلی میں پیدا ہوئے اور اسی شہر میں بریلی ہائی اسکول میں فارسی کے مدرس رہے، بریلی کے اساتذہ میں شمار کیے جاتے تھے[2]، نمونہ کلام پیش ہے،

وہ مہروش اگر سر بازار آئے گا | خود ماہ مصر بن کے خریدار آئیگا

دیدار چشم ساقی میکش کریگا مست | جو میکدے میں جائیگا سرشار آئیگا

آیا خیال ہمسریٔ زلف یار کا | بگڑا دماغ نافۂ مشک تتار کا

آجکل زور پہ ہے گردش قسمت اپنی | عیب ہو جاتا ہے خواہاں جو ہنر کرتے ہیں

چھٹے گا عشق بتوں کا کبھی نہ خواہاں سے | ہزار متقی بنجائے پارسا ہو جائے

پڑی جس طرف کارگر ہو گئی | قیامت وہ تیغ نظر ہو گئی

نواب محمد حسن علی خاں دولہا بریلوی حافظ رحمت خاں کے خاندان سے تھے، اور انیسویں صدی کے آخر برسوں تک حیات تھے[3] ان کے کلام کا نمونہ درج ذیل ہے،

دل عشاق میں کرتے ہیں ٹھکانا اپنا | گھر میں اللہ کے بت دیکھو تو گھر کرتے ہیں

محبت بتوں کی خدا کی قسم | رگ جان کو نیشتر ہو گئی

نواب اسماعیل خاں ذبیح بھی بریلی کے رئیس اور حافظ رحمت خاں کی اولاد میں تھے،

---

[1] خمخانۂ جاوید، جلد سوم [2] ایضاً ج ۳ ص ۶۲ [3] ایضاً ص ۲۱۴

وہ بھی اسی دور کے شاعر تھے[1]، ان کے چند شعر پیش ہیں،

مل جائے کوئی بت تو اسے دل میں جگہ دیں | کعبہ کیلئے ڈھونڈتے پھرتے ہیں صنم ہم

عشق نے ہم سے ازل ہی میں لیا تھا آرام | آنکھ بھی پائی نہ تھی جب سے گیا خواب اپنا

مرزا رضا حسین بیگ رضا بھی اسی دور کے شاعر اور حکیم نیاز احمد خاں ہوش کے شاگرد تھے[2]، انکے چند شعر بطور نمونہ کلام پیش ہیں،

صاحب حیرت ہیں دنیا کے حوادث سے بری | قید کیا دام قفس میں طائر تصویر ہو

شیفتگی بے فائدہ ہے بلبل کی | چند روزہ بہار ہے گل کی

کرنہ پامال گل کو باد خزاں | جان جاتی رہے گی بلبل کی

گنگا پرشاد اوج بریلوی سکسینہ کایستھ اور بریلی کے باشندے تھے، وہیں کلکٹری میں ملازم تھے، فارسی کا ذوق بزرگوں سے میراث میں ملا تھا، خود آتش لکھنوی کے شاگرد اور بلند پایہ شاعر تھے، اپنا ایک دیوان بھی مرتب کیا تھا، طب میں بھی دستگاہ حاصل تھی، اور اس فن میں ایک کتاب مجربات اوج کے مصنف تھے، ۱۸۹۲ء میں ان کا انتقال ہوا[3]، نمونہ کلام پیش ہے،

وحشت ہے طبیعت کو غزالان ختن سے | دیوانہ ترا بن میں بھڑکتا ہے ہرن سے

مستانہ کوئی شعر سناؤں تجھے ساقی | تازہ ہو دماغ اپنا جو صہبائے کہن سے

پر بھی نہ پرندہ کا ہلا فصل خزاں میں | ملتا ہوا صیاد گیا ہاتھ چمن سے

نل عشق کی چوسر میں ہوا اوج سے مغلوب | وہ حسن کی شطرنج میں جیتے ہیں دمن سے

حاجی حسن رضا خاں حسن بریلوی خلف مولانا نقی علی خاں صاحب و برادر مولانا احمد رضا خاں صاحب بریلوی اپنے زمانہ کے ایک زبردست عالم شریعت بھی تھے اور عالی مرتبہ شاعر بھی، ۱۲۷۶ھ (مطابق ۱۸۵۹ء) میں بریلی میں پیدا ہوئے، علوم دین اپنے والد اور بھائی سے حاصل کیے، فن شعر میں اگرچہ وہ داغ دہلوی

---

[1] خمخانۂ جاوید ج ۳ ص ۲۳۵ [2] ایضاً ص ۲۴۶ [3] یادرفتگاں (مصنفہ جگر بریلوی)

کے شاگرد تھے، لیکن نعتیہ کلام اپنے برادر بزرگ مولانا احمد رضا خاں صاحب بریلوی کو دکھاتے تھے، وہ اگرچہ نعتیہ کلام کے پورے دیوان کے مصنف ہیں، لیکن ان کے کلام کا اصل رنگ عاشقانہ ہے اور ان کا وہ کلام جو ان کے انتقال کے بعد شائع ہوا فی الحقیقت بہت اچھا ہے، صفائی، سادگی، بندش کی چستی اور شوکتِ الفاظ کے علاوہ ان کے کلام میں ایک عجیب سوز اور تاثیر ہے، طرزِ بیان میں تیکھا پن غضب کا ہے، تصنع اور آورد نام کو نہیں، "لذتِ سوز و گداز" سے ان کا کلام مملو ہے جو غالباً داغ سے اصلاح کا نتیجہ ہے، جیسا کہ خود کہتے ہیں۔

کیوں نہ ہو میرے سخن میں لذتِ سوز و گداز
اے حسن شاگرد ہوں میں داغ سے استاد کا

ان کا دیوان اگرچہ شائع ہو چکا ہے پھر بھی چند شعر بطور نمونۂ کلام پیش ہیں[1]۔

کیوں دل زار محبت کا نتیجہ دیکھا
دردِ فرقت کا کوئی پوچھنے والا دیکھا

بس رخِ یار سے اٹھتے ہوئے پردا دیکھا
پھر خبر بھی نہ رہی کیا کہیں پھر کیا دیکھا

کان وہ کان ہے جس نے سنی آواز تری
آنکھ وہ آنکھ ہے جس نے ترا جلوا دیکھا

آپ کہتے ہیں کہ جا دیکھ لیا دل تیرا
کہیے تو اپنے سوا دل میں مرے کیا دیکھا

دل کو جاناں سے حسن سمجھا بجھا کر لائے تھے
دل ہمیں سمجھا بجھا کر سوئے جاناں لے چلا

بسملوں کو زخم زخموں کو مبارک لذتیں
سوئے مقتل پھر کوئی تیغ و نمکداں لے چلا

میں کیا پوچھوں کہ ہے میری خطا کیا
عتابِ بے سبب کا پوچھنا کیا

داغِ الفت جگر میں دیکھ لیے
بدگماں اب تو اعتبار ہوا

کیا قیامت ہیں یار کی نظریں
میٹھی چھریوں سے دل فگار ہوا

بے خبر ہو بے خبر کو کیا خبر اس درد کی
سنگدل ہو سنگ دل پر کیا اثر فرہاد کا

---

[1] خمخانۂ جاوید، ج ۲ ص ۵۰۴

کیوں نہ ہو میرے سخن میں لذتِ سوز و گداز
اے حسن شاگرد ہوں میں داغ سے استاد کا

اس شوخ کے انکار سے دل ٹکڑے ہوا کیوں
یا رب کوئی خنجر تو نہ تھا لفظ "نہیں" کا

جس میں تھا انہیں رخِ رنگیں کا تصور
اس دل کو لقب دیجیے فردوسِ بریں کا

سنگِ غمِ فراق سے دل پر لگا نہ چوٹ
آئینہ ٹوٹ جائے گا تیرے جمال کا

جلوے کی روک تھام کریگا حجاب کیا
دریا کے آگے آبِ رواں کی نقاب کیا

دردِ الفت میں زندگی کیسی
موت کا کون چارہ گر ہوگا

خنجر گلے پہ سر تہِ زانوئے دلربا
اے مجرمانِ عشق تمہارا خوشا نصیب

چاہا اگر تمھیں، بہت اچھا، برا کیا
بخشو گے بھی خطائے محبت کسی طرح

آپ کے لطف نے تو قہر کیا
خوب بچتے جورِ آسماں تک ہم

آئے تھے کیا جانیے کیا حسرت لیے
پھر چلے محروم تیرے در سے ہم

دل میں خیالِ گیسوئے پر نور یار ہے
ہم شمع لے کے آئے ہیں اپنے مزار میں

نظارۂ رخِ جاناں کی ہم کو تاب نہیں
وہ بے حجاب ہوئے جب بھی بے حجاب نہیں

مے سے میں نے کب کی توبہ
توبہ توبہ کیسی توبہ؟

شیشہ اٹھا کر طاق سے ہم نے
طاق میں رکھ دی ساقی توبہ

میں جانتا تھا میری ہی الفت کی حد نہیں
لیکن تمہارے ظلم بھی حد سے گزر گئے

میں جانتا ہوں دل پہ جو گزری شبِ فراق
دل جانتا ہے مجھ پہ جو صدمے گزر گئے

دیکھ آؤ مریضِ فرقت کو
رسمِ دنیا بھی ہے ثواب بھی ہے

جو خاص جلوے تھے عشاق کی نظر کے لیے
وہ عام کر دئیے تم نے جہان بھر کے لیے

میں آؤں وعظ میں سو بار جب یہ دل بھی آنے دے
کروں کیا واعظو رندوں کی صحبت ہی کچھ ایسی ہے

نہ باغ جنت کی آرزو کر، نہ جام کوثر کی جستجو کر — شراب الفت حرام ٹھہری پھر اور زاہد حلال کیا ہے

آپ کی ضد نے مجھے اور پلا دی حضرت — شیخ جی اتنی نصیحت بھی بری ہوتی ہے

یہ گل نشانیاں تو نہ ہوتیں کبھی حسن — تم نے چنے ہیں پھول یہ گلزار داغ سے

منشی سرفراز علی رفعت داغ کے ایک دوسرے بریلوی شاگرد تھے، پختہ کلام اور خوشگو شاعر تھے[1] نمونۂ چند شعر پیش ہیں،

نزع میں یار ہے مہمان میرا — دم نکلتا ہے کہ ارمان میرا

اس دست حنائی نے تو اور آگ لگادی — سمجھا تھا کمی ہوگی مرے سوز جگر میں

بھلا راحت کہاں تقدیر میں ہم غم نصیبوں کے — اگر ہوں شادماں دم بھر رہیں اندوہگیں برسوں

اے قیس کہاں ڈھونڈھنے جاتا ہے سوئے دشت — لیلیٰ ترے دل ہی میں ہے محمل میں نہیں ہے

جو داغ میرے دل کو ملا عشق میں رفعت — لالہ میں نہیں ہے مہِ کامل میں نہیں ہے

تری آنکھوں کے جادو کے مقابل — نہیں کچھ اصل سحرِ سامری کی

لیے جاتی ہے دنیا سے عدم کو — تمنا شیخ جی کو حور ہی کی

وہ ملتے ہیں تو یوں ملتے ہیں مجھسے — شناسائی نہیں گویا کبھی کی

کہا جب میں نے مرتا ہوں تو بولے — کہی یہ بات تو نے میرے جی کی

نگاہ یار بھی ہے کیا زمانہ — کسی کی دوست ہے دشمن کسی کی

نہ آیا راہ پہ وہ شوخ رفعت — کریں کیا ہم نے کوشش تو بڑی کی

لچھمن لال شوق بریلی کے باشندے، اور امیر مینائی کے شاگرد تھے، طبیعت میں جدت اور فکر میں پرواز تھی،[2] نمونۂ کلام درج ذیل ہے،

ابھی بے خبر ہے کوئی تو میرا کہے گا حال — ہر ایک کی زباں پہ مری داستاں ہے اب

---

۱ خمخانۂ جاوید، جلد سوم ص ۱۰۸۴ ۲ ایضاً ج ۵ ص ۱۰۴

شہرت ہے جتنی خلق میں حسن و جمال کی — بدنام سب میں اتنی ہی جور و جفا سے آپ

اللہ مٹائے اس بت مغرور کی خودی — کہتا ہے طنز سے "مجھے مانگیں خدا سے آپ"

شرمندۂ گناہ کا اعزاز دیکھیے — آغوش میں لیے ہوئے رحمت خدا کی ہے

قاضی محمد خلیل حیراں قاضی عبد الجلیل جنوں کے بیٹے تھے، [illegible] مطابق [illegible] میں پیدا ہوئے، قاضی جلیل الدین حسن حافظ کے شاگرد تھے،[1] نمونہ کلام یہ ہے

جہاں دیکھا نئے انداز سے وہ شوخ جہاں تھا — نگہ میں نور تھا، پہلو میں دل تھا، دل میں ارماں تھا

بجز خارِ تمنا کچھ نہ پایا باغ عالم میں — گلوں کا ذکر کیا کانٹوں سے بھی محروم داماں تھا

حافظ حفیظ احمد خاں آثم بریلی کے باشندے اور امیر مینائی کے شاگرد تھے، ۱۸۹۱ء تک حیات تھے، اور اسی سال بہ سلسلہ تجارت کلکتہ چلے گئے تھے، دیوان آثم موسوم بہ منظوم حق انکی یادگار ہے جو ۱۳۰۷ھ میں شائع ہوا تھا، ان کی ایک دوسری مثنوی ذائقہ عشق بھی ۱۳۰۹ھ میں شائع ہوئی،[2]

حسینان جہاں دیکھیں جو اسکے روئے روشن کو — بہ حسرت ملا دیں خاک میں سب اپنے جوبن کو

جو ہیں اہل کرم شرمندہ ہوتے ہیں وہ سائل سے — جھکاتا ہے سر ساغر بہ شیشہ اپنی گردن کو

حکیم عبد الصمد سرشار خلف شاہ فیض غوث ساقی بریلی کے شرفا میں تھے، بڑے ذی علم تھے اور فن عروض میں اچھا دخل رکھتے تھے، بریلی کے اساتذہ میں شمار ہوتے تھے، نواب عبد العزیز خاں عزیز بریلوی کے شاگرد اور حسن اور حزاں کے معاصر تھے، طب میں مہارت کامل رکھتے تھے،[3] کلام کا نمونہ پیش ہے،

محبت کی نہ پوچھو کچھ یہ عالم ہی نرالا ہے — کہ ہو سکتا ہے کیا ہو اس میں کیا کیا ہو نہیں سکتا

نغمہ سازئ محبت نالۂ دل ہو گیا — ترے جاتے ہی دگرگوں رنگ محفل ہو گیا

---

۱ خمخانۂ جاوید، ج ۲ ص ۵۲۳ ۲ ایضاً ج ۱ ص ۱۰۴ ۳ ایضاً ج ۴ ص ۱۰۸

ملا کر خاک میں برباد کر چکے ہم کو | خدا کے واسطے دل میں نہ اب غبار رہے

تمام اعضا میں تازگی اور گدازگی ہے جو روز افزوں | نئی جوانی کا جوبن ان پہ چھا گیا ہے کچھ آ رہا ہے

نہ لب ملانے کی مجھ میں قوت نہ بات کرنے کی آب طاقت | کہوں میں کیا تم سے اپنی حالت کہ حال اب مجھ میں کیا رہا ہے

غم و رنج و مصائب ذلت خواری و ناکامی | ہم یکجا ہوئے جس کا محبت نام رکھا ہے[1]

قاضی عبدالحق زہیر بھی اسی دور کے ایک شاعر ہیں، ان کے کلام کا نمونہ پیش ہے،

آپ نے دوست جو دشمن کو سمجھ رکھا ہے | مہرباں یہ بھی تو اک آپ کی نادانی ہے

میں کسی اور سے اور آپ کا شکوہ کرتا | بندہ پرور یہ فقط غیر کی لستانی ہے

منشی سید علی احمد ازہر بریلی کے باشندے اور جناب زہیر بریلوی کے شاگرد تھے، کبھی کبھی مولوی حسن رضا خاں صاحب سے بھی مشورہ سخن کرتے تھے،[2] نمونۂ کلام پیش ہے،

اپنا بیگانہ سمجھ کر دوست و دشمن دیکھ کر | وار تو کرنا مگر اے چشم پرنم دیکھ کر

دیکھو ذرا آئینہ اٹھا کر | کیا ہو گئی شکل رات بھر میں[3]

شعلے اٹھے دل سے دل میں بھڑکے | ہے آگ ہی آگ سارے گھر میں

کوئی بھی غیر کو اپنا سمجھتا ہے زمانے میں | مگر اک آپ ہی ایسے زمانے سے نرالے ہیں

شوق سے ٹکڑے کرو دل نہیں انکار مگر | دیکھ لو اس کو ذرا میری نظر سے پہلے

مولوی علی احمد خاں اسیر بریلی کے باشندے تھے، لیکن قیام زیادہ تر بدایوں میں رہتا تھا، حضرت مذاق کے شاگرد تھے،[4] ان کے دو شعر بطور نمونۂ کلام پیش کیے جاتے ہیں،

ادائیں نہ کیوں چشم کی ہوں پسند | اٹھاتے ہیں سب ناز بیمار کے

یہ دو دن کا ہے رنگ و بو باغباں | نہ تو پھول بھولوں پہ گلزار کے

---

[1] خمخانۂ جاوید جلد ۳، ص ۴۰۹ [2] ایضاً ج ۳، ص ۲۲۸ [3] اس مضمون پر فراق گورکھپوری کا شعر بھی ملاحظہ ہو

صبح تھا [illegible] ذرا آئینہ تو دیکھ لے دوست | ترے جمال کی دوشیزگی نکھر آئی

[4] خمخانۂ جاوید ج ۱، ص ۳۰۷

مولوی علی حسین صاحب شاد بریلوی نواب عبدالعزیز خاں عزیز کے شاگرد اور اپنے عہد کے خوش فکر شاعر تھے،[1]

محمد حسین سحر کا وطن بدایوں تھا، لیکن مسکن بریلی تھا، ریلوے کی ملازمت کے سلسلہ میں لکھنؤ میں بھی رہے، حسن بریلوی کے شاگرد تھے،[2] نمونۂ کلام پیش ہے،

چرخ برگشتہ خفا وہ شوخ وقت مرگ دو | سننے والا کون ہے مظلوم کی فریاد کا

بتاؤں کیا جو کانٹا سا مرے دل میں کھٹکتا ہے | نکل جائے تو نالہ ہے جو رہ جائے تمنا ہے

کنہا لال دل بریلوی منشی درگا پرشاد کے بیٹے تھے، ۱۸۵۰ء میں بریلی میں پیدا ہوئے، شاعری سے طبعی لگاؤ تھا، اور غلام حسین قدر بلگرامی سے مشورہ سخن کرتے تھے، گھر میں آگ لگنے سے کلام تلف ہو گیا،[3] ان کا ایک شعر پیش ہے،

شعر کہنے کے لیے عالم نہ فاضل چاہیے | کشتۂ عشق صنم ہو جو وہی دل چاہیے

کالکا پرساد شاد رام نگر ضلع بریلی کے رہنے والے تھے، ۱۸۶۰ء میں پیدا ہوئے، پولیٹکل ایجنسی ہاروتی، کوٹہ میں ملازم تھے،[4] ان کے چند شعر پیش ہیں،

تحریر مقدر کی مٹائی نہیں جاتی | بگڑی ہوئی تقدیر بنائی نہیں جاتی

نہ گھبرا آبلہ پائی سے اے دل | رہ مقصود کی منزل کڑی ہے

الجھن ہے انتظار ہے دل بیقرار ہے | آ آ ہے کون کس کا تجھے انتظار ہے

منشی سید اولاد حسین رسوا بریلوی (متوفی ۱۹۱۲ء) شعر کم کہتے تھے، لیکن جو کچھ کہتے تھے، خوب کہتے تھے،[5] انکے چند شعر پیش ہیں:

---

[1] خمخانۂ جاوید جلد چہارم، ص ۳۹۸ [2] ایضاً ص ۱۰۷ [3] یادرفتگاں [4] خمخانۂ جاوید ج ۳ ص ۳۳۵

[5] ایضاً ج ۳ ص ۲۰۴

بہار چھا گئی آنکھوں میں جب سرور آیا — شراب پینے سے کافر کے منہ پہ نور آیا

شراب چھوڑ کے بہت ہوئی ہے ڈانواڈول — یہ کیسی توبہ کہ ایمان میں فتور آیا

ہماری آنکھ کی اللہ رے مستیاں ہیہات — کسی حسین پہ نگہ جب پڑی سرور آیا

اک جہان کشتۂ انداز خود آرائی ہے — آپ جو چاہیں کریں آپ کی بن آئی ہے

ہم اتنی زیست میں تنگ آ گئے ہیں حضرت خضر — کہاں سے لاتے جگر عمر جاوداں کے لیے

لالہ ہیبت رام صادق، بریلی میں قانون گو تھے، پرانے الفاظ و محاورات نہایت مرغوب تھے، اور خد و خال کے مضامین بہت پسند تھے۔ ان کے تین شعر پیش ہیں[۱]؛

ہے زلف و رخ کا اسکے ہر دم مجھے تصور — کس طرح خوش نہ گزرے لیل و نہار میرا

میرے دل حزیں کو تم انگار کر چلے — اے واہ وا میاں یہ بھلا پیار کر چلے

دل کے تئیں تو کہتے ہیں سب خانۂ خدا — تم خانۂ خدا کو بھی مسمار کر چلے

شیخ بنے میاں شائق بے چین بریلوی کے شاگرد تھے، اور عموماً ظرافت کے مضامین نظم کرتے تھے۔ نمونۂ کلام پیش ہے[۲]،

آغازِ جوانی میں تم ڈھائے ہوئے ہیں — اٹھتے ہوئے جوبن پہ وہ اترائے ہوئے ہیں

ڈرتے ہیں وفا کرتے ہوئے حضرتِ شائق — یہ لوگ حسینوں سے دغا پائے ہوئے ہیں

سوہن لال شفا بریلوی نیاز احمد خاں ہوش کے شاگرد اور خوش فکر شاعر تھے، ان کے دو شعر درج ذیل ہیں[۳]؛

گیسوؤں کا نہ رہتا نہیں کب دل کو خیال — یہ وہ کافر ہیں کہ کعبہ میں بھی گھر کرتے ہیں

نصیب شربت دیدار ہو اگر ان کا — تو پھر شفا کو نہ کیونکر بھلا شفا ہو جائے

۱؎ خمخانۂ جاوید، جلد پنجم، ص ۳۰۵ ۲؎ ایضاً ج ۴ ص ۴۴۴ ۳؎ ایضاً ج ۵ ص ۵

پادری اے، آر بیلی شفا کا تعلق بھی بریلی سے تھا، وہ عطا بدایونی اور وسیم خیرآبادی سے مشورۂ سخن کرتے تھے، ان کے دو شعر پیش ہیں[۱]،

ہو گیا ہے مری نظروں سے جو پنہاں کوئی — زندگی کا نظر آتا نہیں ساماں کوئی

اب تو پردہ نہ کرو آؤ دکھا دو دیدار — آنکھ میں دم ہے کوئی دم کا ہے مہماں کوئی

مشتاق احمد شوق مونڈیا ضلع بریلی کے رئیس اور پرانی روش کے دلدادہ تھے[۲]، ان کا ایک شعر پیش ہے،

تری زلف معنبر کا اگر مضموں رقم ہوگا — سیاہی مشک ہوگی سنبل تر کا قلم ہوگا

محمد ضیا خاں ضیا بریلوی خواہاں کے شاگرد اور بریلی کے اچھے غزل گو شعرا میں تھے[۳]، ان کے دو شعر پیش ہیں:

دیکھئے ان کا نکھرتا ہے یہ جوبن کس دن — رنگ لاتی ہے بہار رخ روشن کس دن

دوری یار ستاتی ہے تو روتے ہیں ضیا — تر غم یار میں ہوتا نہیں دامن کس دن

سید صادق علی صادق بریلی کے باشندے تھے لیکن اکثر بمبئی میں مقیم رہتے تھے، شستگی اور سادگی زبان کے دلدادہ تھے[۴]، ان کے دو شعر درج ذیل ہیں،

کوچۂ جاناں میں ہم بستر لگائیں گے ضرور — پاسباں سے اور ہم سے اس میں جھگڑا کیوں نہ ہو

نامراد ایسا بھی اٹھا ہے زمانے سے کوئی — حسرتوں کا تربت صادق پہ میلا کیوں نہ ہو

اسی زمانہ میں صادق تخلص رکھنے والے ایک دوسرے شاعر بھی بریلی میں گزرے ہیں، وہ پنڈت دیوی پرساد خلف پنڈت کشن لال کشمیری الاصل برہمن اور منیر شکوہ آبادی کے شاگرد تھے، ان ہی کے مشورے سے فخر سے بدل کر صادق تخلص اختیار کیا، ۱۹۲۱ء میں ستانوے سال کی

۱؎ خمخانۂ جاوید جلد پنجم ص ۶ ۲؎ ایضاً ص ۱۶۸ ۳؎ ایضاً ص ۲۸۸ ۴؎ ایضاً ص ۲۴۹

عمر میں وفات پائی،[1] ان کے تین شعر پیش ہیں،

خوش طینتی سے اے دل ہوتا ہے نام سب کا — نافے سے اپنے آہو مشہور ہے ختن میں

جب نہ ہو خرچ تو کیا مال سے حاصل ہے حریص — یوں تو ہر غنچہ کی مٹھی میں بھی زر ہوتا ہے

سخت دل سوز سے خالی نہیں ہوتے صادق — دیکھ پتھر کے بھی سینے میں شرر ہوتا ہے

مشہور قومی رہنما مولانا محمد علی جوہر کا بھی بریلی سے خاص تعلق تھا، وہ اگرچہ ۱۸۷۸ء میں رامپور میں پیدا ہوئے لیکن ان کی ابتدائی تعلیم بریلی میں ہوئی، ۱۸۹۶ء میں علی گڑھ سے بی، اے پاس کیا اور انگلینڈ چلے گئے، جہاں سے ۱۸۹۹ء میں وہ واپس ہوئے، ۱۹۱۹ء میں خلافت کی تحریک چلا کر جامعہ ملیہ کی بنیاد ڈالی، اور ۱۹۲۳ء میں صدر کانگریس منتخب ہوئے، ۱۹۳۱ء میں لندن میں انتقال ہوا، اور بیت المقدس میں دفن ہوئے، اگرچہ ان کی اصل شہرت ایک قومی رہنما کی حیثیت سے ہے لیکن بحیثیت شاعر بھی ان کا مرتبہ بہت بلند ہے، جیسا کہ ان کے مندرجہ ذیل چند اشعار[2] سے ظاہر ہوگا،

دور حیات آئیگا قاتل قضا کے بعد — ہے ابتدا ہماری تری انتہا کے بعد

تجھ سے مقابلے کی کسے تاب ہے ولے — میرا لہو بھی خوب ہے تیری حنا کے بعد

قتل حسین اصل میں مرگ یزید ہے — اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

ہے رشک ایک خلق کو جوہر کی موت پر — یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے

ہے رشک کیوں یہ ہم کو سر دار دیکھکر — "دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھکر"

شہد و شراب خلد میں یہ چاشنی کہاں — کچھ خون دل سے بڑھ کے مزا ہو تو جانیے

شفقت علی طرب بریلوی بھی موجودہ صدی کے شاعر تھے، حضرت حسن بریلوی سے مشورہ سخن

[1] خمخانۂ جاوید، ج ۵ ص ۲۴۹ [2] جدید اردو شعراء ص ۳۷۹

کرتے تھے، کلام میں کافی روانی پائی جاتی ہے،[1] نمونۂ کلام درج ذیل اشعار ہیں۔

تربت سے اٹھ کے جا نہ سکا کوئے یار تک — یہ ناتوانیوں کا اثر ہے غبار میں

کس خوبرو کو دیکھ لیا کس پہ مٹ گئے — کیوں اے طرب تم آج نہیں اختیار میں

آغاز محبت ہی میں گھبرا گئے ایسے — کیوں حضرت دل نالہ و فریاد ابھی سے

منشی عبد الکریم عروج بریلوی بھی داغ دہلوی کے شاگرد تھے، زبان صاف اور شستہ تھی، ایک شعر بطور نمونہ کلام پیش ہے،[2]

دل کو بہلاؤ ذرا اٹھو ہنسو بولو عروج — رنج و غم میں آدمیت سے گزر جاتے نہیں

عبد الرزاق کلامی بھی موجودہ صدی کے ابتدائی دور کے شاعر تھے، ان کا ۲۰۰ صفحات پر مشتمل ایک مجموعہ کلام موسوم بہ حسام الاسلام ۱۳۳۲ھ (مطابق ۱۹۱۴ء) میں شائع ہوا تھا، اور اسی سال بریلی کے ایک ریختی گو شاعر محمد محسن خان پوری بریلوی المتخلص بہ محسن و عفت بیگم کا ایک دیوان ریختی موسوم بہ رنگیلی بیگم بھی شائع ہوا،

(باقی)

[1] خمخانۂ جاوید ج ۵ ص ۵۵۰ [2] ایضاً ص ۵۸۹

وحدتِ ادیان

از جناب شبیر احمد خاں صاحب غوری ایم اے ایل ایل بی، سابق رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی اتر پردیش

پرامن بقائے باہم اجتماعی زندگی کی اہم ترین ضرورت ہے، اور اگر چھ ہزار سال کی مسلسل تہذیبی اصلاح کے بعد بھی انسان امن و آشتی کے ساتھ رہنا نہ سیکھ سکا تو پھر اس کے اشرف المخلوقات ہونے کا دعویٰ معلوم۔

لیکن "اجتماعی زندگی کی اس اہم ترین ضرورت" کا ضامن و متکفل کیا ہے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس پر عقلائے دہر قدیم زمانہ سے سوچتے چلے آرہے ہیں اور ابتک کچھ نہ سوچ پائے۔ لہٰذا اس کا کوئی قطعی جواب دینا آسان نہیں ہے۔

پھر بھی عہد حاضر میں اس "اہم المہمات" کے حل کے سلسلے میں ایک حل کا بڑے زور و شور سے پرچار کیا جا رہا ہے، اور وہ ہے "وحدت ادیان" کا نظریہ، ہمارے یہاں اس نظریہ کے قائلین میں بعض عظیم شخصیتیں رہی ہیں، مگر مشکل یہ ہے کہ اتنی ہی عظیم شخصیتیں اس کی مخالف بھی رہی ہیں، اس لیے اس نظریہ کی پسندیدگی یا ناپسندیدگی اور معقولیت یا نامعقولیت پر سنجیدگی سے غور کرنا ہوگا، غور و فکر دو طرح سے کیا جا سکتا ہے، منطقی استدلال کے ذریعہ یا تاریخی استقراء کی روشنی میں۔

(۱) منطقی استدلال کا فیصلہ

اس سلسلے میں ایک مسلمہ حقیقت کا اعادہ مستحسن ہوگا، وہ یہ کہ ایک جانب مذہب اور عقل میں اور دوسری جانب مذہب اور اخلاق میں بہت گہرا تعلق ہے، مذہب انسان کا ذاتی معاملہ سہی، یہ بھی

مسلّم ہے کہ وہ انسان کے جذبات و احساسات کے دائرہ میں آتا ہے یا عقل سے زیادہ اُس کا انسان کے جذبات و احساسات سے تعلق ہے، لیکن کسی نہ کسی منزل میں انسان اُسے ایک "خالص عقلیاتی صداقت" ضرور سمجھتا ہے،

مثلاً ایک مسلمان معبود حقیقی کو "واحد اور احد" سمجھتا ہے، اللہ رب العزت کے سوا دوسرے معبودوں کے آگے سر جھکانے یا مبہم طور پر ہی انھیں معبود و مسجود سمجھنے سے اس کا اِبا کرنا ایسی چیز ہے، جسے ممکن ہے خارج سے اس کی نفسیات کا مشاہدہ کرنے والے اس کی شدت جذبات کا نتیجہ قرار دیں، لیکن شعوری یا غیر شعوری طور پر اس کی زندگی میں ایسے لمحات تو ضرور آتے ہیں جب وہ ہر قسم کے جذبات سے معرا ہو کر ٹھنڈی منطق کے ذریعہ سوچتا ہے تو "توحید" کو ایک "خالص عقلیاتی حقیقت" سمجھتا ہے۔

اسی طرح ایک مسیحی تثلیث پر ایسا ہی عقیدہ رکھتا ہے، یہ ممکن ہے کہ کوئی اسے "تین برابر ایک اور ایک برابر تین" کی منافات کے بارے میں قائل کر دے، مگر وہ نہ صرف جذباتی طور پر بلکہ عقلیاتی طریقہ پر بھی اس عقیدہ کی صحت پر منطقی اذعان و یقین رکھنے پر مصر رہے گا، اور یہ یقین واثق رکھے گا کہ وہ اپنے مذہبی علم کلام میں مزید تبحر و تمہر حاصل کر کے اس شکست کی تلافی کر سکتا ہے۔

اب ایک ایسے انسان کی نفسیات پر غور کیجئے، جس نے "وحدت ادیان" کو اپنی تفکیری سرگرمیوں کا سنگ بنیاد بنایا ہے، ظاہر ہے دو چیزوں کی وحدت ان کی ماہیت یا بنیادی اصولوں کی عینیت کا نام ہے، مثلاً سنی اور شیعہ کی وحدت ایک مسلم حقیقت ہے، کیونکہ دونوں اسلام کی بنیادی تعلیم یعنی توحید و رسالت میں متفق العقیدہ ہیں، یہی حال مختلف ہندو فرقوں کی وحدت کا ہے، جو "کرم" اور "آواگون" کے اعتقاد میں ہمزبان ہیں،

بہر حال اس مزعومہ "وحدت ادیان" کے اصول کی رو سے اسلام اور مسیحیت کی بنیادی تعلیمات واحد اور عین یکدیگر ہیں یعنی منطقی طور پر یہ دونوں حقیقتیں کر

۱۔ "ایک" "ایک" ہی رہتا ہے، اور "ایک سے زیادہ" کا عین نہیں ہو سکتا [ورنہ خدائے واحد کی عبادت کے ایجابی امر کے ساتھ "خدایان کثیرہ" کی عبادت اسلام میں ممنوع نہ ہوتی] اور

۲۔ "ایک" "ایک سے زیادہ" [یا تین] کا عین ہو سکتا ہے (اور یہی تثلیث یا Trinity کا اصل الاصول ہے)

بیک وقت صادق ہیں۔

اس طرح اس "مزعومہ وحدت ادیان" کے نفسیاتی نتائج تین ہی ہو سکتے ہیں:۔

(الف) یا تو منطقی استدلال کا یہ کلیدی قانون ہی غلط ہے کہ "اثبات" اور "نفی" قول واحد میں جمع نہیں ہو سکتے۔

مگر اس قانون کی صحت کی ہمہ گیری سے انکار کے لیے عقل انسانی کسی منزل میں بھی تیار نہیں ہو سکتی،

(ب) یا پھر ہار تھک کر اسی نتیجہ پر پہنچنا پڑے گا کہ

"خدا ہی جانے خدا ایک ہے یا بہت سے ہیں"۔ (نعوذ باللہ منہا)

اور یہ وہ تشکیک وادریابیت ہے جسے عقل انسانی صرف انتہائی بے بسی اور واماندگی کے عالم ہی میں اختیار کرنے پر مجبور ہوتی ہے،

(ج) یا پھر ان دونوں متصادم دعووں کو باطل سمجھ لے یعنی اسلام بھی ڈھکوسلا ہے اور مسیحیت بھی ڈھکوسلا ہے اور اسی طرح دوسرے مذاہب بھی ڈھکوسلے ہیں۔ یہ چیز "لامذہبیت" نہیں تو پھر کیا ہے؟

غرض اس "وحدت ادیان" کا انجام تشکیک وادریابیت اور آخرکار بے دینی اور لامذہبیت کے سوا کچھ نہیں،

اس لیے منطقی طور پر "وحدت ادیان" کا نظریہ یا تو باطل محض ہے یا پھر تشکیک وادریابیت اور بے دینی بلکہ انکار مذہب کا پیش خیمہ ہے۔

مذہب و اخلاق

اب اس معما سے نکلنے کی ایک ہی شکل رہ جاتی ہے، وہ یہ کہ مختلف مذاہب کی بنیادی تعلیمات میں "وحدت و عینیت" ثابت کرنے کے بجائے ان میں جو اچھی اچھی باتیں مشترک ہیں، ان پر غور کیا جائے، بات تو بظاہر بڑی معقول ہے، مگر یہ "مشابہت" ہوئی، "مماثلت و عینیت" یا "وحدت" نہ ہوئی اور یہ اصل دعوے سے فرار ہے،

پھر آج تک یہ "بڑی معقول بات" تجزیے کے دائرہ سے نکل کر عمل کی کھلی فضا میں کبھی نہ آسکی اور اس کی ایک وجہ ہے:۔

مذہب اور اخلاق میں چولی دامن کا ساتھ ہے، اور کوئی پائدار اخلاقی نظام مذہبی بنیاد پر استوار کیے بغیر عمل میں نہیں لایا جا سکتا، یورپ کی مثال ہمارے سامنے ہے، جب تک مسیحیت پر یورپ کا ایمان و ایقان رہا، پوری آبادی اس کی مخصوص اخلاقی تعلیمات پر کاربند رہی، مگر جب سائنس کی ترقی ہوئی اور اس کے نتیجے میں مسیحیت کی مذہبی تعلیمات سے بیزاری بڑھنے لگی تو پھر وہاں کے عقلاء نے غیر مذہبی بنیادوں پر اخلاقی تعلیمات کا نظام استوار کرنا شروع کیا، مگر اس میں انھیں سو فیصدی ناکامی ہوئی، خود نفس اخلاق کا دیوالہ نکل گیا، یورپ کی یہ اخلاقی بے راہگی اور گراوٹ جو آج دنیا میں ضرب المثل بنی ہوئی ہے، اسی مذہب سے بے اعتنائی کا نتیجہ ہے۔

لیکن بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی، "اخلاقی پختگی و استواری" کی اساس محض مذہب پسندی ہی نہیں، بلکہ "مذہب واحد کا التزام" ہے، اور "وحدت ادیان" کا عقیدہ منطقی طور پر "تشکیک وادریابیت" بلکہ "بے دینی اور لادینیت" کی طرف لیجاتا ہے، اور یہ ظاہر ہے نہ تو تشکیک وادریابیت کسی ایجابی نظام کی اساس بن سکتی ہے، اور نہ "لادینیت" ہی اس چیز کی بنیاد بن سکتی ہے جس کی تاسیس صرف دین و مذہب ہی پر ممکن ہے۔

وحدت ادیان اور رواداری یہ ہے منطق اور معقولیت پسندی کا فیصلہ، مگر ہماری خوش فہمی (یا خود فریبی) نے ان تمام سنگین حقائق سے صرف نظر کرکے ایک اور پرفریب ڈھکوسلے کا سہارا لیا ہے، جس کا نام رواداری ہے، مگر

۱۔ تجربہ بتاتا ہے کہ "وحدت ادیان" کے عقیدے کی اشاعت "رواداری" کے جذبے کو ترقی دینے کے بجائے اس کے ضعف و انحلال ہی کا موجب بنی ہے، چنانچہ عہد حاضر کی فرقہ وارانہ تباہ کاریوں کی تہ میں جو سازشیں کارفرما ہیں، وہ اسی نظریہ کے نام نہاد علمبرداروں کی رہین احسان ہیں،

۲۔ رواداری کا حقیقی علمبردار اسلام ہے، نہ صرف اس کی تعلیمات بلکہ اسکی تاریخ بھی رواداری کی روشن مثالوں سے بھری ہوئی ہیں، اور اسلام "مذہب واحد" ہی کے التزام کی تعلیم دیتا ہے،

(۲) تاریخ کا فیصلہ

غرض "وحدت ادیان" کے نظریہ کا اگر منطقی دقت نظری کے ساتھ تجزیہ کیا جائے تو انسان دوستی اور اخلاقی ترفع کی توقعات پوری کرنے میں ناکام ہی ثابت ہوگا،

یہ تو منطق کا فیصلہ ہے جس کی اصابت کو بہرحال چیلنج کیا جا سکتا ہے، مگر منطق کے علاوہ ایک اور حاکم بھی ہے، یہ ہے تاریخ۔ اور تاریخ کا صدیوں کا فیصلہ ہے کہ

"وحدت ادیان کے مفروضہ نے صلح کل کے بہانے معاشرہ کے اخلاقی نظم وضبط کو منتشر کرنے میں بہت زیادہ کام کیا ہے"۔

اس کے ساتھ یہ بھی تاریخ کا ایک ناقابل تردید واقعہ ہے کہ تفلسف 'وحدت ادیان' اباحت اور سفاکی و باطل خواجگی میں چولی دامن کا ساتھ رہا ہے، اس حقیقت کا تاریخی جائزہ غالباً دلچسپی سے خالی نہ ہوگا،

یہ ایک تلخ اور ناخوشگوار حقیقت ہے کہ فلسفہ عرصہ دراز سے اسلام کے سیاسی اقتدار کے زوال

کے ساتھ ساتھ اس کی مذہبی و تعلیمی گرفت کے انحلال کا بھی خواہاں تھا، تاتاری جبروتی نے اسکی اس حسرت دیرینہ کو پورا کیا، اس کے بعد تفلسف نے تصوف کے نام سے اسلام کے امتیاز کو "وحدت ادیان" اور "صلح کل" کے نام پر ختم کردیا، چنانچہ حافظ ابن تیمیہؒ ان مدعیان تصوف کے بارہ میں جو "با مسلماں اللہ اللہ با برہمن رام رام" کے قائل ہیں، الرد علی المنطقیین میں فرماتے ہیں،

وھؤلاء المتفلسفة ومتصوفوھم کابن سبعین واتباعه یجوزون ان یکون الرجل یھودیا او نصرانیا اومشرکا یعبد الاوثان فلیس الاسلام عندھم واجبا..... واذا جاء المرید الی الشیخ من شیوخھم وقال ارید ان اسلك علی یدیك یقول له علی دین المسلمین او الیھود او النصاری؟ فاذا قال له المرید: الیھود والنصاری اما ھم کفار؟ یقول لا ولکن المسلمون خیر منھم وھذا من جنس جھال التتار اول ما اسلموا فان الاسلام عندھم خیر من

اور یہ مدعیان فلسفہ و تصوف جیسے ابن سبعین اور اس کے پیرو اس بات کو جائز رکھتے ہیں کہ آدمی یہودی و نصرانی حتی کہ بت پرست مشرک بھی ہوسکتا ہے، اسلام انکے نزدیک ضروری نہیں ہے...... چنانچہ جب کوئی مرید ان کے کسی شیخ کے پاس آکر کہتا ہے کہ میں آپکے ہاتھ پر راہ سلوک طے کرنا چاہتا ہوں تو شیخ پوچھتا ہے کہ کس دین کے مطابق؟ مسلمانوں کے یا یہودیوں کے یا نصرانیوں کے؟ اگر مرید ان سے کہے کہ کیا یہود و نصاریٰ کافر نہیں ہیں تو وہ جواب دیتا ہے نہیں، ہاں مسلمان ان سے بہتر ہیں، یہ بالکل جاہل تاتاریوں کے جیسا معاملہ ہے جو شروع شروع میں اسلام لائے تھے، کیونکہ اسلام ان کے نزدیک دوسرے مذاہب

غیرہ وان کان غیرہ جائزاً	بہتر تھا، اگرچہ وہ دوسرے مذاہب کو بھی
لایوالون علیہ ولا یعادون علیہ	جائز سمجھتے تھے جن سے نہ انھیں دوستی تھی اور نہ دشمنی

شام اور عراق و ایران وغیرہ اسلامی ملکوں میں جہاں اکثریت مسلمانوں کی تھی، وحدت ادیان کے رجحان کو پر پرزے نکالنے کا زیادہ موقع نہ مل سکا، لیکن ہندوستان میں اسے پوری طرح کھل کھیلنے کا موقع مل گیا، بالخصوص مغلوں کی حکومت کے زمانہ میں رواداری جیسا کہ اوپر مذکور ہوا، اسلام کی تعلیمات کا رکن رکین ہے، لیکن مذہب معین کا التزام بھی ہمیشہ سے اخلاقی نظم و ضبط کا ضامن رہا ہے، ہندوستان میں جب اس نام نہاد "صلح کل" کو پر پرزے نکالنے کی آزادی ملی تو اخلاقی نظم و ضبط بڑی تیزی سے منہدم ہونے لگا، اس میں کوئی شک نہیں کہ دنیادار اہل غرض، ان صوفیائے کرام کے پاس بیشتر حالات میں صرف دنیوی مرادوں کے لیے دعا کرانے جاتے تھے، اس لیے منطقی طور پر انجام کار اس میں مسلم و غیر مسلم کی تفریق بیکار ثابت ہوئی، اس لیے مسلم سوسائٹی کے اعلیٰ طبقہ نے جب مسلمان صوفیاء کی خدا ترسی و عقبیٰ شناسی کو اپنی نفسانی خواہشات کے بر لانے میں حارج پایا تو انھوں نے غیر مسلم متصوفین، بالخصوص جوگیوں وغیرہ کی جانب رجوع کیا، اس کا آغاز ہمیں محمد تغلق (۷۲۵ھ - ۷۵۲ھ) کے زمانہ سے ملتا ہے، عصامی اس کے بارے میں لکھتا ہے:-

ز آئین اسلام سر تافتہ	ابا زمرۂ کفر در یافتہ
بر انداختہ رسم بانگ نماز	شدہ دور از اہل دیں در گداز
جماعت ہمہ در انداختہ	ابا ہندواں ہو لیے باختہ
ابا جوگیاں گشتہ خلوت گرا	بدل راہ کفار را دادہ جا

عصامی محمد تغلق کا نکتہ چیں ناقد تھا، مگر ابن بطوطہ تو اس کا احسان مند تھا، وہ بھی اسکی خلوت کا

ایک واقعہ لکھتا ہے جہاں جوگی اسے "شکتی یوگیہ" کی تعلیم دیا کرتے تھے، اور انھوں نے اس کا عملی مظاہرہ کر کے اسے دہشت زدہ کر دیا تھا،

پھر بھی سلاطین دہلی کو کچھ دینی پاسداری اور کچھ غیرت ایمانی محمد تغلق کی روش پر چلنے سے مانع رہی، مگر مغلوں کے زمانہ میں جوگیوں سے خلا ملا اور استمداد کا رواج بہت زیادہ بڑھ گیا، اکبر پرکھوتم برہمن سے اقتدار پرستی کے سستے نسخے سیکھا کرتا تھا، بدایونی نے لکھا ہے:-

"جند گاہے پرکھوتم نام برہمنے را کہ معبر نامہ خرد افزا بود، در خلوت بردہ اسامی ہندی از برائے موجودات اشیاء بزبان خاص بید اختراع می خواستند و جند گاہے دیوی برہمن را کہ از جملہ معبران مہابھارت بود، بر چارپائے نشاندہ وبالا کشیدہ نزدیک بقصرے کہ آنرا خواب گاہ ساختہ بودند معلق داشتہ از وے اسرار و افسانہائے ہندی و طریق عبادت اصنام و آتش و آفتاب و تعظیم کواکب و احترام اساطین کوہ از برہما و مہادیو و بشن و کشن و رام و مہامائی کہ بودن ایشان از بنی نوع انسان موہومات و نبودن تیقن ...... بآنجانب گرائیدند" (منتخب التواریخ ص ۲۲۲)

اس زمانہ میں جدروپ (جترروپ) سنیاسی کی بڑی شہرت تھی، جو اجین میں رہتا تھا، اکبر بھی خاندیش کی فتح کے بعد اس سے ملنے گیا، وہ ہمیشہ اس کی تعریف کیا کرتا تھا، جہانگیر اپنی تزک میں لکھتا ہے:-

"در حالت کہ والد بزرگوارم قلعہ اسیر و ولایت خاندیش را فتح نمودہ بتوجہ دار الخلافہ آگرہ بودند - در ہمیں جا در مقام (اجین) او را دیدہ بودند و ہمیشہ خواب یاد می کردند" (تزک جہانگیری ص ۱۷۶)

اکبر کے بعد جہانگیر تخت نشین ہوا، اس کی تخت نشینی حضرت مجدد الف ثانی اور شیخ عبد الحق محدث

دہلوی اور ان کے انداز فکر پر سوچنے والے دوسرے مصلحین کی مساعی کا نتیجہ تھی، اور اس میں فرید خاں بخاری وغیرہ اسلام پسند امراء کی کوششوں کا بڑا دخل تھا، اس لیے شروع میں جہانگیر نے اس نام نہاد "صلح کل و رواداری" اور "مزعومہ وحدت ادیان" کی جو حقیقت ملحدانہ رجحانات کے علاوہ اباحت اور بدترین فسق و فجور کی پہلی منزل تھی، بڑی سختی سے بیخکنی کی، چنانچہ پانچویں سال جلوس میں اس سے شکایت کی گئی کہ کچھ لڑکے ایک سنیاسی کے پاس جاکر بیٹھتے ہیں، اس اختلاط و مجالست میں اسے الحاد و ارتداد کا خطرہ نظر آیا، اس لیے حزم و دوراندیشی کے پیش نظر ان لڑکوں کی تنبیہ و تادیب کے لیے سخت احکام جاری کیے، چنانچہ خود پانچویں سال جلوس کے واقعات میں لکھتا ہے:

"دریں روزہا ظاہر شد کہ کوکب پسر قمر خاں بہ سناسیئے آشنائی پیدہ کردہ درفتہ رفتہ سخنان او کہ تمام کفر و زندقہ است، در مذاق آں جاہل جا کردہ، عبداللطیف پسر نقیب خاں و شریف عم زادہائے خود را دریں ضلالت با خود شریک ساختہ بودہ است، تادیب و تنبیہ آں را لازم دانستہ کوکب و شریف را بعد از شلاق مقید و محبوس ساختم و عبداللطیف را یک صد و رہ حد فرمودم کہ در حضور زدند۔ ایں تنبیہ خاص بجہت شریعت بودہ تا دیگر جاہلاں امثال ایں امور ہوس نکنند۔" (تزک جہانگیری ص ۸۲)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ "الناس علی دین ملوکھم" کے مصداق اکبر نے سناسیوں وغیرہ سے جوگ اور زندقہ سیکھنا شروع کیا تھا، اس سے یہ رسم عوام میں بھی پھیل گئی تھی، اور اگر آئندہ بھی جہانگیر اسی طرح "جہت حفظ شریعت" میں کمربستہ رہتا تو شاید وہ اسکی بیخکنی میں کامیاب ہو جاتا، یا کم از کم اسے وبائی شکل اختیار نہ کرنے دیتا،

لیکن جب ۶ جلوس میں نور جہاں حرم میں داخل ہو گئی تو پھر "جہت حفظ شریعت"

میں اتنی ڈھیل پڑ گئی کہ خود بادشاہ سلامت ان جوگیوں اور سناسیوں سے استمداد کیلئے ان کی کٹیوں پر جانے لگے، پہلے پدر بزرگوار کے مقتدا بہ جدروپ سے عقیدت ہوئی، اور اسے دربار میں بلانے کا ارادہ کیا، مگر پھر اسے زحمت دینے کے بجائے خود بدولت نے زحمت فرمائی اور گیارھویں سال جلوس میں اس کے پاس پہنچے، چنانچہ اس سال کے واقعات میں لکھتے ہیں:-

"مکرر شنیدہ بودم کہ سناسیے مرتاضے جدروپ نام کہ چندیں سال کہ نزدیک بمعمورۂ اجین در گوشۂ صحرا از آبادانی دور متوجہ و مشغول پرستش معبود حقیقی است، خواہش صحبت او بسیار داشتم، و قتیکہ در دار الخلافہ آگرہ بودم، می خواستم کہ او را طلبیدہ ببینم، غائبانہ ملاحظہ تصدیع او کردہ نطلبیدم، چوں بحوالی شہر مذکور رسیدم از کشتی برآمدہ نیم پاؤ کردہ پیادہ بدیدن او متوجہ گشتم ...... خالی از دانش نیست۔ علم بیدانت را کہ علم تصوف باشد خوب ورزیدہ۔ تا شش گھڑی با او صحبت داشتم۔ سخنان خوب مذکور ساخت۔ چنانچہ خیلے در من اثر کرد۔ او را ہم صحبت من در افتادہ۔" (تزک جہانگیری ص ۱۸۵-۱۸۶)

دو سال بعد وہ پھر اس کی زیارت سے مشرف ہوئے، چنانچہ تیرھویں سال جلوس کے ضمن میں لکھتے ہیں:

"روز کم شنبہ بست و نہم با جدروپ کہ از مرتاضان کیش ہنود است و تفصیل احوال او در اوراق سابق نگاشتۂ کلک وقائع نگار گردید صحبت داشتہ، بسیر و تماشائے کالبدہ توجہ فرمودم بے تکلف صحبت او از مغتنمات است۔" (تزک جہانگیری ص ۲۵۰-۲۵۱)

اگلے سال جب جدروپ اجین سے متھرا آ گیا تو جہانگیر کو پھر اسکی کشش نے کھینچا اور وہ پھر اس کی خدمت میں حاضر ہوا، چنانچہ چودھویں سال جلوس کے ضمن میں لکھتا ہے،

"گوسائیں جدروپ کہ در اجین گوشۂ انزوا داشت ...... درینولا از اوجین بمتھرا کہ از اعاظم معابد ہنود است نقل مکان نمودہ برکنار دریائے جمنا بعبادت معبود حقیقی اشتغال دارد۔ چوں صحبت او پیرامون خاطر می گشت، بقصد ملاقات او شتافتم و زمانے ممتد در خلوت بی زحمت غیر صحبت داشتہ شد۔ الحق کہ وجودش بغایت مغتنم است۔ در مجلس او محظوظ و مستفید می تواں شد۔" (تزک جہانگیری، ص ۲۷۹)

دو سال کے بعد بنارس کا ایک اور ہندو "وددوان" دربار میں آیا، اس کا نام رودر بھٹا چارج تھا، چنانچہ سولھویں سال جلوس کے ضمن میں مرقوم ہے:

"دریں ایام رودر بھٹا چارج نام برہمنے کہ از دانشوران ایں گروہ است، دریں زمین بافادہ و استفادہ اشتغال داشت، دولت ملازمت دریافت۔ الحق مطالب عقلی و نقلی را خوب ورزیدہ و در فن خود تمام است۔" (تزک جہانگیری ص ۳۲۹)

جہانگیر کے بعد شاہجہاں تخت نشین ہوا، وہ ان ڈھکوسلوں کے بجائے نصرت خداوندی اور اپنی قوت و بازو پر زیادہ بھروسہ کرتا تھا، اس لیے اس نے بہت سی غیر شرعی رسوم کا خاتمہ کر دیا، مگر یہ وبا عام ہو چکی تھی، اور خصوصیت سے امراء کا طبقہ ہندو جوگیوں اور سناسیوں کا بیحد عقیدت مند تھا، ان میں عبدالرحیم خانخاناں خاص طور سے قابل ذکر ہے، وہ تو جدروپ کا اس درجہ عقیدت کیش تھا کہ اس کے آگے سجدہ کرتا تھا، صاحب دبستان المذاہب نے جہانگیر کو جدروپ سے جو عقیدت تھی، اس کے ذکر کے بعد لکھا ہے:

"گسائیں جدروپ از گروہ دندھاری است از نژاد برہمنان گجرات کہ آں فرقہ را ناگر برہمن گویند، و پدرش در سلک جوہریان آں دیار انتظام داشت، جاہ مند و سامان خداوند بود۔ جدروپ در یزداں پرستی بزرگی یافتہ، زن و مادر و پدر و فرزنداں را ہشتہ طریقہ سناسیان

اختیار نمود ...... حضرت جنت مکانی شاہ نورالدین جہانگیر انار اللہ برہانہ معتقد او بود، پاس خاطر او را کما ینبغی می داشت۔ و عبدالرحیم خانخاناں پیش او سجدہ می کرد۔"

(دبستان المذاہب)

اس سجدۂ غیر اللہ میں تو کوئی استبعاد نہ ہونا چاہیے، اقتدار پرستی کا یہی انجام ہوتا ہے، جس سر کو مسجود حقیقی کے سامنے جھکنے میں تکلف ہوتا ہے، غیرت خداوندی اس کی پیشانی پر داغ ذلت و رسوائی لگائے بغیر نہیں چھوڑتی، اپنے ہی ابنائے جنس کے سامنے سر جھکانے سے لیکر کائنات کی حقیر ترین مخلوقات تک کے سامنے اس کا ماتھا ٹکوا دیتی ہے، شرک سے قطع نظر "وحدت ادیان" اور "صلح کل" کا نتیجہ کبھی کبھی فسق و فجور کی شکل میں بھی ظاہر ہوتا ہے، اس کی مثال ظفر خاں والی کشمیر اور گسائیں ترلوچن کے تعلقات ہیں، ہوس اقتدار کے بھوکے ظفر خاں نے تبت کی فتح کے لیے گسائیں ترلوچن کی خوشامد کی اور اسکی فرمائش پر اس کے لیے طوائفیں مہیا کیں، چنانچہ صاحب "دبستان المذاہب" نے ترلوچن کے تذکرے میں لکھا ہے:

"احسن اللہ مخاطب بظفر خاں خواجہ ابوالحسن ترمذی کہ حاکم کشمیر بود، بتوسط محرمان حرم خودش کہ باگسائیں کمال ربط داشتند، آشنا شد، التماس نمود کہ بر تبتیاں فیروزی یابد۔ ترلوچن گفت تسخیر تبت تواں کرد، اگر بموجب فرمودہ عمل نمائی۔ ظفر خاں پذیرفت، عہد و پیمان را از جانبین استوار کردند۔ ترلوچن فرمود، جمعے از لولیان را تعین کن کہ پیوستہ از من جدا نشوند، چہ دریں کیش با لولی آمیزش ستودہ تر از زنان دیگر است ...... و از شراب و مسکرات دیگر بزم ما تہی نباشد ...... ظفر خاں بدانچہ گسائیں فرمود، عمل نمود۔ چوں بر تبت لشکر کشید، فیروز گشت و مظفر باز آمد، انجام میان گسائیں و ظفر خاں پایان بخش

بیان آمد، گوسائیں از دست ظفر خان بیرون رفت. مقارن بدیں ظفر خاں بنا بر نزاع سنی و شیعہ کشمیر سبک شد..... ترلوچن..... گفت از زر بخش من آں ہمہ آسبب بظفر خاں رسید" (دبستان المذاہب ص ۱۹۱)

رواداری اور "صلح کل" کو اس معنی میں تو صحیح کہا جا سکتا ہے کہ دوسرے مذاہب اور ان کے ماننے والوں سے محض اختلاف مذہب کی بنا پر عناد نہ رکھا جائے اور اپنے مذہب پر استقامت کے ساتھ ان کے ساتھ اخلاق و انسانیت کا برتاؤ کیا جائے، یہ معنی نہیں ہیں کہ اپنے دین و مذہب کو اس پر سے نثار کر دیا جائے، اور اس معنی میں وحدت ادیان کی تحریک سے کوئی مفید نتیجہ بھی برآمد نہیں ہوتا، ہندوستان میں اس قسم کی جتنی تحریکیں ہوئیں سب کا خاتمہ ناکامی پر ہوا، زیادہ سے زیادہ ایک نیا ناقابل ذکر فرقہ پیدا ہو گیا جس کا کسی مذہب میں شمار نہیں ہوتا، اکبر کے دین الٰہی کا ذکر اب صرف کتابوں میں ملتا ہے، کبیر پنتھیوں کا شمار نہ مسلمانوں میں ہے اور نہ ہندوؤں میں، اس لیے یہ تحریک ہی لغو ہے، صحیح رواداری اور صلح کل یہی ہے کہ ہر شخص اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے دوسرے اہل مذاہب کے ساتھ شریفانہ سلوک کرے۔

مولانا ابو الکلام آزاد پر پہلی کتاب

از جناب ابو سلمان شاہجہانپوری

مولانا ابو الکلام آزاد پر چھوٹی بڑی چالیس کتابیں میری نظر سے گذر چکی ہیں، اخبارات و رسائل کے وہ تیس نمبران کے علاوہ ہیں، جو مولانا کی یاد میں شائع ہوئے ہیں، یہ تمام کتابیں اور رسالے بجز ایک عربی رسالہ کے اردو اور انگریزی میں ہیں، برصغیر پاک و ہند کی دوسری کسی زبان کی کوئی کتاب یا رسالہ میری نظر سے نہیں گذرا، لیکن یہ معلوم ہے کہ بنگالی، تلنگی پنجابی، پشتو، سندھی وغیرہ زبانوں میں بھی مولانا مرحوم پر کتابیں اور رسالے شائع ہوئے ہیں، اردو اور انگریزی کے بارے میں بھی یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ مولانا آزاد پر صرف وہی کتابیں اور رسالے ہیں جو میری نظر سے گذرے ہیں، عام اندازے کے مطابق مولانا آزاد پر تقریباً ایک سو کتابیں اور اخبارات و رسائل کے خصوصی شمارے شائع ہوئے ہیں، اس مضمون میں مولانا پر ایک کتابچے کا تعارف کرانا مقصود ہے، اس کا نام "امام الاحرار حضرت مولانا ابو الکلام آزاد" ہے، اور "عصر جدید بک ایجنسی کلکتہ" کے زیر اہتمام فروری ۱۹۲۳ء میں شائع ہوا تھا، مولانا کے سلسلے میں یہ کتابچہ بوجوہ ذیل اہمیت رکھتا ہے:

۱- جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے مولانا آزاد پر یہ پہلی مستقل تصنیف ہے،

۲- پیش نظر کتابچہ "آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی" مرتبہ مولانا عبد الرزاق ملیح آبادی کا خلاصہ ہے، کہانی کا کوئی مبحث ایسا نہیں جو اس کتابچے میں اختصار کے ساتھ نہ آگیا ہو

اور اس لیے وہ غلطیاں بھی موجود ہیں جو واقعات کی تفصیل، اشخاص و کتب کے ناموں اور تواریخ و سنین کے بیان میں ملیح آبادی مرحوم سے ہوئیں،

۳۔ مولانا ملیح آبادی کی تصنیف "ذکر آزاد" کی ایک کمی اس سے پوری ہوگئی ہے، ذکر آزاد میں مولانا ملیح آبادی نے ہندوستان کی سیاسی صورت حال اور نصب العین کے بارے میں چند سوالات کے جوابات میں مولانا کی ایک تحریر نقل کی ہے، سوالات کے بارے میں انھوں نے معذرت کی ہے کہ اصل پرچہ ضائع ہوگیا لیکن اس کتابچہ میں نہ صرف جوابات ہیں بلکہ سوالات بھی ہیں، نیز اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ "ذکر آزاد" میں ایک اہم سوال کا جواب بھی چھوٹ گیا ہے،

۴۔ اس کتابچہ کے مطالعے سے مولانا آزاد کی زندگی کے بارے میں بعض دلچسپ واقعات اور جیل کے معمولات کا علم ہوتا ہے، اور ان کے اخلاق و کردار پر بھی روشنی پڑتی ہے،

۵۔ آسان و سادہ و صحیح زبان، دل کش طرز تحریر اور مضامین و مباحث کی سائنٹفک تقسیم و ترتیب کی بنا پر بھی اس کی ایک خاص اہمیت ہے،

یہ کتابچہ بہتر صفحات پر مشتمل ہے، صفحہ ایک سے تیئیس ۲۳ تک "آزاد کی کہانی" کا خلاصہ ہے، جسے مصنف نے نہایت خوبصورتی کے ساتھ اپنے الفاظ میں بیان کر دیا ہے، اس میں مولانا کے خاندان، تعلیم و تربیت، ابتدائی علمی و ادبی مشاغل وغیرہ کا تذکرہ اور مذہبی خیالات کا نشوونما" کے زیر عنوان خیالات میں تبدیلی کے اسباب و محرکات کا بیان کیا ہے اور اس سلسلے میں مولانا آزاد کی وہ تحریر نقل کی ہے جو انھوں نے ۱۹۳۱ء میں علی پور جیل میں مولانا ملیح آبادی کے ایک سوال کے جواب میں لکھ دی تھی اور ذکر آزاد میں موجود ہے (صفحہ ۷۳-۲۴۹)

کتابچہ کے ابتدائی حصے میں جو "آزادی کی کہانی" کا خلاصہ ہے، مولانا حالی سے پہلی ملاقات اور ان کی حیرت و استعجاب کے متعلق "کہانی" سے مختلف واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ: "انجمن حمایت اسلام کے جلسہ میں، مولانا نے اس چھوٹی سی عمر میں نہایت دلیری اور روانی اور قابلیت کے ساتھ لکچر دیا، مولانا حالی کو تو اس واقعہ سے اس قدر تعجب ہوا کہ انھوں نے علانیہ کہہ دیا کہ انھیں یقین نہیں ہوتا کہ یہ لکچر خود مولانا کا ہے، چنانچہ اس کے بعد انھوں نے امتحاناً خود ایک موضوع دیا اور جب مولانا نے اسی وقت اس موضوع پر بھی تقریر کر دی تو انھیں ماننا پڑا مگر تعجب دور نہ ہوا،" (صفحہ ۹)

لیکن حقیقت یہ ہے کہ انجمن کے جلسے میں اس قسم کے امتحان کا کوئی واقعہ پیش نہ آیا، بات وہی صحیح ہے جو ملیح آبادی نے تحریر فرمائی ہے، یعنی مولوی وحید الدین سلیم نے مولانا حالی مرحوم سے مولانا آزاد کی تقریب کی تو انھیں بڑا تعجب ہوا اور بمشکل انھوں نے یقین کیا، کہ "لسان الصدق" کے اڈیٹر یہی ہیں، چوں کہ یہ صورت وحید الدین سلیم سے ملاقات کے وقت بھی پیش آچکی تھی، اس لیے انھوں نے تقریب کی یہ صورت اختیار کی،

مولانا آزاد کی زبانی ملیح آبادی مرحوم تحریر فرماتے ہیں:

"بہرحال جب انھیں (مولوی وحید الدین سلیم کو) یقین ہوگیا تو اصرار کیا کہ چلو مولانا حالی سے ملیں، مولانا (حالی) کی قیام گاہ پر آئے اور آتے ہی انھوں نے مولانا سے میری طرف اشارہ کرکے پوچھا کہ آپ کے خیال میں ان کی عمر کیا ہے؟ مولانا نے بے انتہا سنجیدہ لہجے میں بہت تامل کرکے کہا کہ ابھی کمسن ہیں، انھوں نے پھر زور دیا کہ نہیں بتایئے عمر کتنی ہے؟ مولانا نے کہا کہ پندرہ سولہ برس کی ہوگی، انھوں نے کہا "لسان الصدق" کے یہی اڈیٹر ہیں" مولانا نے کہا "جو کلکتہ سے نکلتا ہے؟" میں نے کہا "ہاں!" "لیکن انھیں

اطمینان نہ ہوا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ معاملے میں کوئی پیچیدگی سی محسوس کرتے ہیں، جب مولوی وحید الدین سلیم نے اپنے تعجب کا بھی ذکر کر کے انھیں یقین دلایا کہ یہی اڈیٹر ہیں بمجرد اس یقین کے وہ بہت ہی خوش ہوئے، میں دور بیٹھا تھا، مجھے قریب بلایا اور حالات پوچھنے لگے "کیا آپ ابھی پڑھتے ہیں؟" میں نے کہا نہیں، میں اپنی تعلیم ختم کر چکا ہوں"۔ کہنے لگے "کتنا عرصہ ہوا؟" میں نے کہا "دو تین سال" اس پر انھیں اور بھی تعجب ہوا، اس دن سے وفات تک وہ برابر شفقت فرماتے رہے اور ہمیشہ ان کے خطوط آتے رہے۔

اس واقعہ کے تذکرے پر "کہانی" کا خلاصہ ختم ہو جاتا ہے اور مصنف کا اصل کارنامہ شروع ہوتا ہے، سب سے پہلے "اصلاح و ہدایت و ارشاد" کے عنوان سے الہلال کے اجراء کا پس منظر بیان کیا گیا ہے اور ہندوستان کی مذہبی حالت، جدید و قدیم علماء، ان کے کردار اور اسلام و قرآن کے بارے میں مسلمانوں کے رسمی و روایتی تصورات پر روشنی ڈالی ہے، اور الہلال کے اجراء اور اس کی دعوت و خدمات سے بحث کی ہے اور اکابر مثلاً حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن اور مولانا شوکت علی کے اعترافات کو نقل کیا ہے، صفحہ ۲۳ سے ۳۷ تک الہلال کی بندش، کلکتہ سے مولانا کے حکم اخراج اور رانچی میں نظربندی کا تذکرہ ہے، اس سلسلے میں "تذکرہ" کی آخری پوری فصل نقل کر دی گئی ہے، رانچی میں مولانا کے قیام، خطبات جمعہ کے اہتمام اور مسلمانوں کی بیداری کا تذکرہ ہے، مدرسہ رانچی کے سلسلے میں لکھا ہے کہ بہت سے لوگوں نے اس کے قیام کے ارادے سے منع کیا تھا اور کہا تھا کہ کامیابی ممکن نہیں بلکہ خود کمشنر نے ہنسی اڑائی تھی اور مسٹر ایس، پی سنہا نے کہا تھا، ہائی اسکول قائم کریں گے یا کھپریل کا ایک جھونپڑا ڈال لیں گے، لیکن مولانا نے ہمت نہ ہاری اور کچھ دنوں کے بعد لوگ ایک عالی شان عمارت دیکھ کر حیران رہ گئے، خود کمشنر عمارت دیکھ کر سخت متحیر ہوا اور اس کی سفارش پر بہار گورنمنٹ نے مزید زمین، پندرہ ہزار روپیہ نقد

اور تین سو روپئے ماہوار کا عطیہ اسکول کو دینا چاہا لیکن مولانا نے سرکاری امداد لینے سے انکار کر دیا۔ (ص ۳۶)

کتابچہ کے مطالعہ سے مزید معلوم ہوتا ہے کہ مدرسہ کی عمارت پر سولہ ہزار روپئے صرف ہوئے تھے، مولانا کی کوششوں سے ۲۵ ہزار روپئے کی زمین مدرسہ کے لیے وقف کی گئی تھی، مولانا آزاد اس زمانے میں سخت تنگی اور عسرت میں زندگی گذار رہے تھے، گھر کی قیمتی اشیاء اور زیور فروخت ہو چکا تھا، لیکن نہ تو انھوں نے گورنمنٹ کا وظیفہ قبول کیا، نہ کسی انجمن کی کسی قسم کی امداد قبول کی اس سلسلے میں مصنف نے لکھا ہے

"کلکتہ سے دو ہزار روپئے اور دہلی سے ڈھائی ہزار روپئے بھیجے گئے مگر مولانا نے اسے بھی قبول کرنے سے انکار کر دیا، اور جب بہت مجبور کر دیے گئے تو یہ ساڑھے چار ہزار روپئے اسکول فنڈ میں منتقل کر دیا جس سے اس کی چھت پاٹی گئی، حالانکہ جس روز انھوں نے ایسا کیا ہے گھر میں ایک ہفتہ سے تقریباً فاقہ کی نوبت تھی" (ص ۳۸)

اس کے بعد مولانا کی رہائی، مسئلہ خلافت اور تحریک ترک موالات کے سفر و جلسہ ترک موالات کے پروگرام، مولانا آزاد کے زیر صدارت صوبائی خلافت کانفرنس کے اجلاس کلکتہ، مولانا کا خطبۂ صدارت وغیرہ کا تذکرہ ہے، اسی زمانہ میں مولانا محمد علی جوہر نے ایک تقریر میں کہا تھا:

"اگر افغانستان ہندوستان پر حملہ آور ہوگا تو مسلمانان ہند افغانستان کا ساتھ دیں گے، کیونکہ یہی ان کا مذہبی حکم ہے۔" (ص ۴۳)

مولانا محمد علی کے اس بیان پر ہنگامے اور اس سلسلے میں مولانا آزاد کے ایک معرکہ آرا مقالے اور تحریک لاتعاون کے سلسلے میں مولانا آزاد کی خدمات کا تذکرہ ہے، یہ تمام مباحث پیش نظر رسالے کے صفحہ ۳۹ سے ۴۷ تک پھیلے ہوئے ہیں، اس سلسلے میں مختلف سیاسی مسائل کی نسبت مولانا کے خیالات بھی پیش کیے گئے ہیں، ذکر آزاد میں مولانا ملیح آبادی تحریر فرماتے ہیں:

"جیل میں جب ہم تھے تو میں نے مولانا سے درخواست کی کہ اپنے سیاسی مسلک کی تشریح لکھ دیں۔ مولانا نے فرمایا سوال مرتب کرو جواب لکھ دوں گا۔ میں نے سوال پیش کر دیے، افسوس سوالوں کا مسودہ محفوظ نہیں رہا، مگر جواب میں مولانا کی تحریر محفوظ ہے، یہاں نقل کرتا ہوں۔" (ص ۲۷۲-۲۷۳)

لیکن اس کتابچہ میں نہ صرف مولانا کے جوابات ہی ہیں، بلکہ مولانا ملیح آبادی کے سوالات بھی درج ہیں جن کے محفوظ نہ رہنے کا انھیں افسوس تھا۔ پیش نظر کتابچہ سے صرف سوالات ہی کا علم نہیں ہوتا یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ایک سوال کا جواب بھی ضائع ہو گیا تھا، ان سوالات کی اہمیت کے پیش نظر انھیں یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

(۱) سوراج کے معنی برٹش امپائر کے ماتحت ہیں یا مکمل؟

(۲) کیا مہاتما (گاندھی) جی کے نون وائی لنس نون کواپریشن سے ہندستان کو سوراج مل سکتا ہے؟

(۳) نون کواپریشن میں نون وائی لنس کی شرط آپ کے نزدیک کیسی ہے؟

(۴) موجودہ ہندو مسلم اتحاد کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

(۵) خلافت کے مطالبات کیا ہیں؟ اور گورنمنٹ کی کس کارروائی سے اطمینان ہو سکتا ہو؟

(۶) مخالفین ہند کے اس اعتراض کا کیا جواب ہے کہ اگر سوراج ہو جائے تو مسلمان ترکی یا افغانستان کو نہ بلالیں گے؟

(۷) کیا چرخہ قومی زندگی میں مستقل جگہ لے سکے گا؟

یہ تمام سوالات اور جوابات اس رسالے کے صفحہ ۴۸ سے ۵۴ تک درج ہیں، "ذکر آزاد" میں سے چھ سوالوں کے صرف جواب درج ہیں، سوال نمبر ۵ کا جواب "ذکر آزاد" میں نظرانداز ہو گیا ہے، اس کے جواب میں مولانا فرماتے ہیں:

"مطالبات خلافت کی تشریح میری کتاب اردو اور انگریزی میں شائع ہو چکی ہے، مختصراً

مطالبات یہ ہیں کہ عراق، فلسطین اور شام کو انگریزی یا فرنچ مینڈیٹری میں رکھنے کی کوشش ترک کر دی جائے، انھیں بالکل چھوڑ دیا جائے تاکہ وہ آزاد و خود مختار حکومت خلیفۃ المسلمین کے زیر سیادت قائم کر لیں، تھریس اور سمرنا ترکوں کو واپس دیدیا جائے، قسطنطنیہ، درۂ دانیال اور خلیفۃ المسلمین کی حکومت پر کسی طرح کی پابندی عائد نہ کی جائے۔ اسلام کے مقدس مقامات کا اہتمام خلیفہ کے زیر اقتدار رہنا چاہیے۔" (ص ۵۴)

صفحہ ۵۴ سے ۶۷ تک مولانا آزاد کی تصنیفات کا تعارف کرایا ہے، اور اس مقصد کیلئے مولانا کی وہی تحریر درج کی گئی ہے جو مولانا ملیح آبادی مرحوم نے "ذکر آزاد" میں نقل کی ہے،

صفحہ ۶۸ سے ۷۱ تک علی پور جیل میں مولانا کے معمولات اور اخلاق و عادات کا ذکر ہے، اس سے ہمیں بعض اہم اور دلچسپ باتوں کا پتہ چلتا ہے، اس سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ

(۱) مولانا ہمیشہ اپنے سیل (کوٹھری) میں علمی مشاغل میں مصروف رہا کرتے تھے، اپنی کوٹھری سے کبھی نہیں نکلتے تھے، البتہ جب ایک مرتبہ پاؤں میں کچھ تکلیف ہو گئی تو صبح و شام جیل کے احاطے میں چہل قدمی کرنے لگے تھے،

(۲) مغرب اور عشا کی نماز ایک وارڈ میں جس کا نام "سیگریگیشن" تھا، باجماعت ہوتی تھی، اور مولانا اس میں روز تشریف لاتے تھے،

(۳) صبح و شام جب جیل کے احاطے میں مولانا نکلتے تو مشتاقین دید و کلام کی تمنائیں پوری ہو جاتیں اور چاروں طرف سے خدام پروانہ وار گھیر لیتے تھے، اس وقت میں جو کم و بیش ایک گھنٹہ ہوتا، مولانا مختلف مسائل پر گفتگو فرماتے اور لوگوں کو استفادہ کا موقع عنایت فرماتے (ص ۶۸)

(۴) عید کی نماز کے موقع پر جیل کے لیے جو امام صاحب مقرر تھے وہ تشریف لائے مگر

چونکہ وہ بدیشی کپڑے پہنے ہوئے تھے اس لیے تارکین موالات نے کوشش کی کہ مولانا امام بنیں مولانا نے انکار کردیا اور فرمایا کہ جو یہاں کا قاعدہ ہے ہم کو اس کی مخالفت کی ضرورت نہیں۔

عیدالاضحیٰ کے موقع پر وہ امام صاحب کسی وجہ سے نہ آئے اور جیل کے حکام نے کہدیا کہ نماز کا انتظام لوگ خود کرلیں، چنانچہ اس مرتبہ مولانا نے امامت کی مصنف رسالہ تحریر فرماتے ہیں

"اللہ اکبر وہ بھی عجیب منظر تھا جب جیل کے احاطہ کے اندر تین سو تارکین موالات اور کئی سو عام قیدیوں نے ایک بڑی جماعت کے ساتھ مولانا کی امامت میں نماز ادا کی اور جیل کے اندر مولانا نے اردو میں خطبہ دیتے ہوئے حق کا اعلان کیا مولانا نے معمولی قیدیوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا، کس قدر افسوس ہے کہ تم لوگ چوری، ڈکیتی اور قتل و غارت کے جرم میں جیل آئے ہو جس سے خود تمہارے خدا نے تمھیں روکا ہے، اگر تم مذہب و ملک کے لیے جیل آتے تو یہ ایک بات ہوتی،

یہ سزائیں جو تم یہاں بھگت رہے ہو یہ تو دنیاوی حکومت تم کو دے رہی ہے اب خدا کے یہاں جو سزا تم کو ایسے جرائم کی ملے گی وہ اس کے علاوہ ہے بس تمھیں چاہیے کہ اپنے انجام کو سوچو اور اللہ کے آگے عاجزی سے اپنے تمام گناہوں سے توبہ کرو۔"
(ص ۹۹ تا ۱۰۰)

مولانا مرحوم کے ضبط و برداشت کے متعلق اس رسالے کے مصنف تحریر فرماتے ہیں:

"......سیاسی قیدی آزادی کے ساتھ آپس میں ملتے جلتے تھے، مگر مولانا کے صبر و ضبط کا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جیل میں آپ ہی تنہا تھے جو اپنی زندگی کے دائمی اصول پر قائم رہے، جیل کی تنہائیوں نے کوئی اثر آپ پر نہیں ڈالا اور آپ کو وہاں جاکر اپنی کوئی وضع چھوڑنی نہیں پڑی۔

یہ بات بظاہر کوئی اہم نہیں معلوم ہوتی مگر اس سے دل کی مضبوطی اور عزم استقلال

کے رسوخ کا اندازہ ہوتا ہے، اور کچھ شک نہیں کہ یہ خدا کا ایک عظیم الشان فضل ہے۔" (ص ۱۰۰-۱۰۱)

علی پور جیل سے مولانا کی رہائی کے سلسلے میں لکھا ہے:

"مولانا کی رہائی کا دن حساب سے ۹ جنوری تھا مگر حکام جیل نے اس خیال سے کہ شاید اسی دن جیل کے دروازہ پر کلکتہ ٹوٹ پڑیگا دفعتاً ۵ جنوری کی رات کو مولانا کو خبر دی کہ آپ کو رہا کیا جاتا ہے، مولانا نے فرمایا کہ سردی کی رات ہے اور صحت اچھی نہیں، اس وقت جانے میں تکلیف ہوگی، اس لیے میرے لیے اس میں آسانی ہے کہ صبح کو جاؤں، سپرنٹنڈنٹ نے کہا کہ اس میں حرج تو کوئی نہیں ہے مگر مجھے اندیشہ ہے کہ جیل کے پھاٹک پر لوگوں کا ازدہام ہوجائے گا، مولانا نے فرمایا کہ میں آپ کو اطمینان دلاتا ہوں کہ ایسا نہ ہونے دوں گا، سپرنٹنڈنٹ راضی ہوگیا، اکثر اسباب اور کتابیں تو رات ہی میں مولانا کے مکان پہنچادی گئیں اور صبح کو اندھیرے ہی میں مولانا رہا کر دیے گئے۔

......مولانا نے جیل سے آتے ہی فرمایا کہ 'کانگریس میں جو دو جماعتیں ہوگئی ہیں یہ ملک کے لیے نہایت مضر ہے'، اور جب پوچھا گیا کہ آپ کا اب کیا پروگرام ہوگا تو فرمایا کہ 'سب سے پہلے میں کانگریس کی دونوں جماعتوں میں صلح کرانے کی کوشش کروں گا'۔ چنانچہ مولانا نے فوراً بمبئی اور الہ آباد کا سفر کیا اور دونوں جماعتوں کو آمادہ کیا کہ دونوں کچھ نرم ہوکر ایک پلیٹ فارم پر آجائیں۔"

مولانا آزاد نے ترجمان القرآن جلد اول کے دیباچے میں مدت اسارت ۱۰ دسمبر ۱۹۲۱ء سے پندرہ ماہ بتائی ہے، یعنی اس حساب سے فروری ۱۹۲۳ء کے اواخر میں رہائی پائی، انڈیا ونس فریڈم میں بتایا ہے کہ مجھے ایک سال کی سزا ملی تھی لیکن میں یکم جنوری ۱۹۲۳ء تک رہا نہیں کیا گیا لیکن اس رسالہ سے مدت اسارت اور تاریخ رہائی کا قطعی تعین ہوجاتا ہے

اوپر جو اقتباس نقل کیا گیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کی رہائی کی تاریخ ۹ جنوری ۱۹۲۳ء تھی لیکن انھیں ۵ جنوری کی شام کو گھر جانے کی اجازت مل گئی تھی، اور اگرچہ مولانا نے اپنا کچھ سامان رات ہی کو گھر بھیج دیا، لیکن وہ خود ۶ جنوری کو صبح سویرے جیل سے نکلے تھے۔

یہ رسالہ چونکہ کانگریس کے اسپیشل اجلاس (۱۹۲۳ء) سے پہلے شائع ہوا تھا جو مولانا آزاد کے زیر صدارت دہلی میں ہوا تھا، اس لیے اس میں مولانا کی اس شاندار کامیابی پر تبصرہ نہیں کیا جا سکا، جو کانگریس کے دونوں گروہوں کو ایک پروگرام کے تحت لانے میں مولانا کو حاصل ہوئی تھی، البتہ حالات کی رفتار کی بنا پر صلح کی امید کا اظہار کیا گیا ہے اور اسی بیان پر رسالہ ختم ہو جاتا ہے، چونکہ ان آخری سطور سے رسالہ کی تاریخ تصنیف کا تعین بھی ہو جاتا ہے، اس لیے یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ یہ آخری سطور نقل کر دی جائیں۔

مصنف رسالہ فرماتے ہیں:-

"آج کہ ۱۰ فروری ہے، یہ خبر آ چکی ہے کہ دونوں پارٹی صلح پر آمادہ ہیں اور مولانا کی پیش کی ہوئی شرطوں کو تسلیم کرتی ہیں، اب ورکنگ کمیٹی اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی دونوں کا اجلاس عنقریب ہوگا، اور پوری امید ہے کہ مولانا کی کوششوں سے صلح ہو جائیگی۔" (۱۷-۲-۷)

اس رسالہ کے سلسلے میں اب ایک اہم سوال یہ رہ گیا کہ اس کا مصنف کون ہے؟ تو یہ بات قطعی طور پر معلوم ہے کہ آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی "ملیح آبادی کی روایت ہے، اور ۳۷ برس تک ان ہی کے قبضے میں رہی، مولانا کے سیاسی مسلک کے بارے میں سوالات ملیح آبادی نے کیے تھے، جیسا کہ ذکر آزاد سے صاف طور پر ظاہر ہے، اور مولانا کے جوابات کا مسودہ ان ہی کے پاس محفوظ تھا، ملیح آبادی علی پور جیل میں مولانا کے ساتھ تھے، اس لیے

گمان یہی ہوتا ہے کہ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی اس رسالے کے مصنف ہوں گے، لیکن حقیقت اس کے خلاف ہے، اس رسالہ کے مصنف کلکتہ کے مشہور اخبار عصر جدید کے مالک و اڈیٹر مولانا شائق احمد عثمانی ہیں، ۱۹۲۱ء میں مولانا عثمانی بھی مولانا آزاد اور ملیح آبادی کے رفیق جیل تھے، ۱۹۲۲ء میں مولانا شائق احمد عثمانی جیل سے رہا ہوئے تو مولانا ملیح آبادی نے "آزاد کی کہانی......" کا مسودہ ان کے ہاتھ جیل سے باہر بھیج دیا اور جیسا کہ راقم سطور کے نام مولانا عثمانی کے ایک خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ نومبر ۱۹۲۲ء سے جب عصر جدید کو دوبارہ جاری کیا گیا تو آزاد کی کہانی کا خلاصہ اور مولانا آزاد سے متعلق ایک طویل مضمون عصر جدید کی کئی اشاعتوں میں شائع کیا، فروری ۱۹۲۳ء میں یہی مضمون کتابی صورت میں شائع کیا۔

مولانا آزاد کے مذہبی خیالات کے نشو و نما یا سیاسی مسلک کی وضاحت کے سلسلے میں سوال و جواب کی تمہید میں یہ بات واضح کی جا سکتی تھی کہ جیل میں مولانا آزاد سے یہ سوالات مولانا ملیح آبادی نے کیے تھے، اور مولانا آزاد کے خاندانی اور دیگر حالات کا ماخذ آزاد کی کہانی ہے، جو ملیح آبادی نے جیل میں مولانا ہی کے الفاظ میں قلم بند کی ہے، لیکن مولانا ملیح آبادی اس وقت جیل میں تھے، اس لیے ان کا نام ظاہر کرنا خلاف مصلحت تھا، آزاد کی کہانی کا مسودہ اور دوسری تحریریں جو مولانا ملیح آبادی نے مولانا شائق احمد عثمانی کے ذریعے جیل سے باہر بھیجی تھیں، اُس وقت تک ان ہی کے قبضے میں رہیں، جب تک مولانا ملیح آبادی رہا نہیں ہو گئے۔

تلخیص و تبصرہ

برطانیہ میں اسلام

برطانیہ میں مسلمان بہت کم ہیں، ان کی تعداد پانچ ہزار سے زیادہ نہیں ہے، اور اسلام کی اشاعت اسی صدی کے آغاز یعنی ۱۹۱۳ء میں یہاں ہوئی، جبکہ ایک برطانوی لارڈ نے اسلام قبول کیا، ان کے مختلف مضامین میں جو اس زمانہ کے رسالوں میں شائع ہوئے تھے اس کی تفصیل نکل چکی ہے، مصر سے محمد رشید رضا کی ادارت میں نکلنے والے مجلہ منار میں بھی ان کے اسلام کی سرگذشت چھپی تھی، اس میں اُن اسباب و علل کا بھی ذکر تھا جس کی بنا پر وہ حلقہ بگوش اسلام ہوئے تھے،

انگلستان میں اسلام کی اشاعت کی رفتار بہت مدھم رہی ہے، کیونکہ حکومت برطانیہ اسلام قبول کرنے والے مسلمانوں کو طرح طرح کے مصائب اور دشواریوں میں مبتلا کر دیتی تھی، بیان کیا جاتا ہے کہ ایک لارڈ نے جب اپنے اسلام کا اعلان کیا تو برطانوی استبداد نے لارڈ کا لقب ختم کرکے اس کو تمام حقوق و مراعات سے محروم کر دیا، آخر میں اس کو ایسے سخت حالات کا سامنا کرنا پڑا کہ اس نے مجبور ہو کر اسلام ترک کر دینے کا اعلان کیا، اس کے بعد اس کو تمام حقوق دوبارہ مل گئے،

اسلام سے ان لوگوں کی واقفیت یا تو اصل ماخذوں کے مطالعہ یا مسلمان

پڑوسیوں اور کاروباریوں سے تعلقات پیدا کرنے سے ہوئی، ان لوگوں نے ایسے ارباب علم سے واقفیت حاصل نہیں کی جو واقعات کو توڑ مروڑ کر اپنے ذوق کے مطابق اسلام کی تعبیر اور ترجمانی کرتے ہیں، شروع میں تو یہ رجحان یورپین مصنفین کی تصنیفات میں بہت زیادہ کارفرما تھا، مگر اب وہ ایک حد تک اعتدال سے قریب تر ہو گئے ہیں، اور اکثر اسلام پر ایسی کتابیں لکھ رہے ہیں، جو مجموعی حیثیت سے اقرب الی الصواب ہوتی ہیں، یہ تبدیلی اول تو اس احساس کا نتیجہ ہے کہ گذشتہ طرز عمل پر قائم رہنا مناسب اور درست نہیں، دوسرے اب اکثر لوگ اسلام سے اس کے اصلی ماخذوں کے ذریعہ واقف ہوتے ہیں، اس لیے وہ اس کی خالص اور اصلی حقیقت کو سمجھ لیتے ہیں، تاہم کچھ پھر بھی گذشتہ اثرات کی وجہ سے وہ غلطیوں کا ارتکاب کرتے رہتے ہیں،

بعض انگریزوں نے عربی زبان میں اچھی دستگاہ حاصل کی، اور اسلام کو ٹھیک ٹھیک سمجھ کر اس کو قبول کیا، اور وہ اس کی تبلیغ و اشاعت کا کام بھی کر رہے ہیں، اور جہاں تک ممکن ہوتا ہے اس سے متعلق مضامین اور کتابیں بھی لکھتے رہتے ہیں،

نومسلم انگریزوں کی مادری زبان انگریزی ہے، لیکن ان میں سے اکثر کو عربی سیکھنے کا شوق ہے، تاکہ وہ قرآن مجید پڑھ سکیں اور نماز عربی تلفظ میں ادا کر سکیں۔

انگلستان میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد ان لوگوں کی ہے جو انگریزی نسل سے تعلق نہیں رکھتے بلکہ وہ دوسرے ملکوں سے آکر یہاں آباد ہوئے ہیں، ان میں انگلستان سے سیاسی تعلقات رکھنے والے ممالک پاکستان، ہندوستان، ملیشیا، جنوبی افریقہ، نائیجریا، گھانا اور کینیا وغیرہ کے لوگ زیادہ ہیں، ان سب کی ٹھیک مجموعی تعداد بتانا مشکل ہے بعض لوگوں کا اندازہ ہے کہ یہ ۵ لاکھ ہوں گے، ساحلی شہروں مثلاً لورپول، کارڈف

میں بعض عربی النسل یمنی اور جنوبی جزیرہ اور سومالیہ کے لوگ بھی ہیں، یہ لوگ زیادہ تر جہازوں اور بندرگاہوں میں کام کرتے ہیں، انگریز نسل کے لوگوں کے حلقہ بگوش اسلام ہونے کا سبب ان مسلمانوں کی موجودگی بھی ہے، جن سے وہ گھل مل کر کاروبار میں شریک ہوتے ہیں، ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جو مسلمان طلبہ انگلستان کی یونیورسٹیوں میں تعلیم پاتے ہیں ان میں اکثر اچھے مسلمان ہوتے ہیں، ان کے اثرات ان کے انگریز دوستوں اور ساتھیوں پر بھی پڑتے ہیں،

برطانوی مسلمانوں کے مسائل و معاملات کے لیے حکومت کی جانب سے کوئی ذمہ دار اور جوابدہ شعبہ نہیں ہے، جس طرح کہ اسلامی حکومتوں میں عیسائیوں کے لیے ہوتا ہے۔

برطانوی مسلمانوں کے لیے ایک ایسی جماعت کی ضرورت ہے جو مسلمانوں کے مسائل و معاملات کی جانب دھیان دے اور ان کی نماز وغیرہ کی تنظیم کرے، اس قسم کی جماعتیں ان علاقوں میں تو بن گئی ہیں، جہاں مسلمانوں کی خاصی تعداد ہے، یہ لوگ اپنے دین کی خاطر انگریزی تہذیب و تمدن میں ضم ہونا نہیں چاہتے، اسی خیال سے جماعت کی تشکیل کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں، اسلام کا نام بڑا جامع ہے، اس لیے اسی کے نام پر جماعت کا نام رکھتے ہیں اور ایسے مرکز کی تلاش میں رہتے ہیں جہاں وہ نماز کے لیے اکٹھا ہوسکیں، تاکہ بعد میں مسجد میں بھی تبدیل ہوجائے، جیسا کہ کیرک وغیرہ میں ہوا ہے، کہ وہاں لوگوں نے ایک مسجد اور ایک مدرسہ کی تعمیر کرلی ہے، ان لوگوں کو اسلامی ممالک خصوصاً متحدہ عرب جمہوریہ سے جہاں وزارت اوقاف اور جامع ازہر موجود ہے امداد آتی رہتی ہے، ان کے پاس اکثر اسلامی مطبوعات و رسائل موجود ہوتے ہیں، اور ہر خاندان میں ایک یا ایک سے زیادہ مصحف و مسجل بھی پایا جاتا ہے جس کو قاہرہ کی اسلامیات کی مجلس اعلیٰ تمام ملکوں میں بھیجتی رہتی ہے،

اس طرح کی جماعتیں اکثر بڑے شہروں مثلاً لیورپول، مانچسٹر، برمنگھم، آکسفورڈ، کیمبرج اور اڈنبرا وغیرہ میں پائی جاتی ہیں،

اسلامی مرکز انگلستان کا سب سے بڑا اسلامی مرکز "اسلامی ثقافتی مرکز" کہلاتا ہے، اس مجلس میں انگلستان میں رہنے والے تمام اسلامی حکومتوں کے سفراء شریک ہیں، اور انگلستانی مسلمان اپنے جملہ امور و مسائل میں اسی کی جانب رجوع کرتے ہیں، مرکز کا منتظم اور منیجر ہمیشہ جامع ازہر کا کوئی ماہر اور فاضل ہوتا ہے، اس کی حیثیت یہاں پر شیخ الاسلام جیسی ہوتی ہے، مرکز مسلمانوں کے حالات سے باخبر رہتا ہے، اور ان کے فتاوے اور استفسارات کے جواب دیتا ہے، اسلامی طریقہ کے مطابق شادی بیاہ کراتا ہے، اور اسلام سے متعلق تقریروں کا بھی انتظام کراتا ہے، مقررین انگلستان کے سربرآوردہ مسلمان یا وہاں باہر سے آئے ہوئے مشہور لوگ ہوتے ہیں، بعض اوقات غیر مسلم مستشرقین بھی مدعو کیے جاتے ہیں،

مرکز میں ایک بڑا اسلامی کتب خانہ بھی ہے، جس میں زیادہ تر عربی کتابیں ہیں، انگریزی کتابیں بھی ہیں، گو اس میں اضافہ کی بڑی ضرورت ہے، انگلستان کے مسلمانوں کے نقطہ نظر سے یہ ایک نہایت اہم مقام سمجھا جاتا ہے، اور یہیں تمام مسلم جماعتوں کے اجتماعات منعقد ہوتے ہیں، انگلستانی عدالتیں بھی اسلامی مسائل و موضوعات کے متعلق اسی مرکز کی جانب رجوع کرتی ہیں اور اس کی رائے کو آخری اور قطعی سمجھتی ہیں،

مرکز کے ایک حصہ میں نماز ادا کرنے کی بھی ایک جگہ ہے، جس میں ہر ہفتہ جمعہ پڑھا جاتا ہے، ابھی تک کوئی مسجد نہیں تعمیر کی جاسکی ہے، کیونکہ اس کے لیے برطانوی حکومت نے سیاسی طور پر اجازت اور منظوری نہیں دی ہے، لندن میں ۱۶ مقامات میں جمعہ کی نماز پڑھی جاتی ہے، لیکن وہاں مسجدوں جیسی عمارت نہیں ہے، لندن سے ۵۰ میل کے فاصلہ پر

ووکنگ میں مسجد کی طرح کی ایک عمارت ہے جس میں ایک چھوٹا سا مینار بھی ہے، لوگ عربی زبان میں نماز ادا کرتے ہیں، خطبہ جمعہ عربی اور انگریزی دونوں زبانوں میں دیا جاتا ہے، تاکہ عام مسلمانوں کو اسلامی احکام و تعلیمات سے آگاہ کیا جاسکے، زیادہ تر لوگ عربی زبان نہیں جانتے، صرف السلام علیکم کہہ لیتے ہیں اور عربی میں نماز ادا کرتے ہیں،

اسلام اور مسلمانوں کا برطانوی حکومت کو نہ تو کوئی خیال ہے اور نہ ان سے کوئی دلچسپی ہے، وہ اپنے ملک کے مسلمانوں اور ان کے امور و مسائل کے سلسلہ میں کسی قسم کی امداد و اعانت بھی نہیں کرتی، اس کا اندازہ صرف اسی ایک واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے، کہ ۱۹۵۴ء میں لندن کے اسلامی ثقافتی مرکز کے ایک حصہ میں تعمیر مسجد کا مسلہ طے ہوگیا ہے لیکن برطانوی وزارت تعمیرات نے ابتک اس کی تعمیر کی اجازت نہیں دی۔

برطانوی حکومت کے لیے ضروری ہے کہ وہ مسجد کے معاملہ کی اہمیت کو سمجھکر دنیا کے کروڑوں مسلمانوں کے جذبات کا خیال رکھے، اور اپنے ملک کے مسلمانوں کو ان کے دینی شعائر کو کسی رکاوٹ کے بغیر بجا لانے کا موقع دے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ مساجد کا طرز تعمیر وہاں کے عام طرز تعمیر کے برعکس ہے لیکن درحقیقت کوئی قوی دلیل نہیں ہے، کیونکہ وہاں کی شاندار اور بلند عمارتیں بھی قدیم اور مالوف طرز تعمیر کے مطابق نہیں ہیں، اس کا مشاہدہ لندن کی زیارت کرنے والا ہر شخص اس کے گلی کوچوں میں کرسکتا ہے، اسلامی ملکوں میں غیر مسلموں کو اس بات کے لیے مجبور نہیں کیا جاتا کہ وہ اپنی عبادت گاہیں مسجدوں کے طرز پر تعمیر کریں، ہر دین و مذہب کے لوگوں کو اپنے شعائر اپنے طریقہ کے مطابق انجام دینے کا موقع دینا چاہیے، انگریزوں کو بھی مسلمانوں کے معاملہ میں اسی فیاضی اور رواداری کا ثبوت دینا چاہیے۔

(ض)

کمیونسٹ ملکوں کے مسلمان

فلسطین کے بعد سب سے اہم مسئلہ اشتراکی حکومتوں کے مسلمانوں کا ہے، متحدہ سوویٹ یونین میں تین مسلم حکومتیں ہیں، یہاں کے مسلمانوں کی تعداد ۴ کروڑ ہوگی، یہ تینوں حکومتیں یعنی قوقازہ، ترکستان اور قازان اسلامی تاریخ کی اہم حکومتوں میں شمار کی جاتی تھیں، لیکن اس وقت ان کی کوئی حیثیت نہیں رہ گئی ہے،

ان ملکوں کی ایک طویل اور قدیم تاریخ ہے، مسلمان پہلی صدی ہجری ہی میں ان کے اندر داخل ہوئے تھے، اور یہاں ان کے شہر آباد ہوگئے تھے، تاریخ کی کتابوں میں بلاد ماوراء النہر کے نام سے اُن کا ذکر ملتا ہے، اُس زمانہ میں یہاں کے اہم شہر تاشقند، بخارا، سمرقند، نیشاپور، فرغانہ اور آذربائیجان کا ذکر کوفہ، بصرہ، دمشق، بغداد، مکہ اور مدینہ ہی کی طرح کیا جاتا تھا، ان کے علما، علمائے ماوراء النہر کہلاتے تھے،

ائمہ محدثین امام بخاری، مسلم اور ابن ماجہ وغیرہ کا یہیں سے تعلق رہا ہے، گیارہ سو برس تک یہ اسلام کے قلعے سمجھے جاتے رہے ہیں،

کئی صدیوں کے بعد یہ شہنشاہ روس کے محکوم بن گئے، مسلمان روسی امپریلزم کا جس قدر مقابلہ کرسکتے تھے، کرتے رہے، لیکن وہ شخصی حکومت موجودہ کمیونسٹ حکومتوں سے بہتر تھی کیونکہ اس زمانہ میں یہاں سے ہزاروں کی تعداد میں مسلمان مکہ معظمہ جاکر حج کرتے تھے، لیکن ۱۹۱۷ء میں جب لینن کی مارکسی اشتراکیت کی حکومت قائم ہوئی تو یہ ممالک اس کا حصہ بن گئے، یہاں کے مسلمانوں کو اُن کے جائز اور فطری حقوق سے محروم کردیا گیا، مذہبی عقائد و عبادات وغیرہ کی آزادی سلب کرلی گئی،

اشتراکیت دین و مذہب کی دشمن ہے، اسکے لیڈر کارل مارکس نے مذہب کو فقیروں کا افیون بتایا ہے، ایک اشتراکی اول وہلہ ہی میں خدا کے وجود کی نفی اور صرف مادیت کو اپنا دین سمجھتا ہے، اسلیے دین خواہ کوئی ہو کمیونزم کا اس سے تصادم ناگزیر ہے،

سوویٹ یونین کی اشتراکی حکومت کو مسلمانوں سے جنگ کا اندیشہ تھا، اسلیے اس نے ۱۹۱۷ء ہی میں انکو اپنی متحدہ حکومت میں مدغم کرنے کیلیے ایک ایسا اعلان جاری کیا جس میں مسلمانوں کو مذہبی فرائض و عبادات کی بجاآوری اور ریاست کے اسلامی مدرسوں میں بچوں کے تعلیم دلانے کی آزادی کا ذکر تھا،

اشتراکیوں نے اسلامی حکومتوں کو اپنے اندر شامل کرنے ہی پر اکتفا نہ کیا بلکہ تمام دنیا کے مسلمانوں کی ہمدردی اور تائید حاصل کرنے کیلیے ۱۹۱۹ء میں ان سے یہ اعلان کرایا کہ روس میں مسلمانوں کو انفرادی آزادی حاصل ہے، لیکن اس قسم کے اعلانات خواہ وہاں کی مسلم حکومتوں ہی کی جانب سے کیوں نہ ہوں محض فریب ہیں،

ترکستان کی حکومت کی مکمل خود مختاری کا اعلان تو کر دیا گیا لیکن باوجود اسکے وہاں کے شہروں سے قوم پرور امراء و حکام کو معزول کر دیا گیا اور انکی جگہ ایسے لوگ لائے گئے جو اشتراکی تحریک میں شامل ہو چکے تھے، اعلیٰ اور متوسط طبقہ کے لوگوں سے انکی ملکیتیں چھین لی گئی تھیں، اور جن لوگوں میں بغاوت یا انقلاب کا دم خم تھا انکا زور اور اثر اس طرح ختم کر دیا گیا کہ بعض لوگ قتل کر دیے گئے اور بعض کو شدید ترین سزائیں دی گئیں،

ترکستان ہی جیسے حالات قوقاز میں بھی پیش آئے، یہاں کا دارالسلطنت باکو ہے جو تیل کے چشموں کی وجہ سے نہایت مالدار شہر ہے، اشتراکیوں نے یہاں کی قومی و وطنی حکومت کو بھی تبدیل کر دیا اور وہ سارے مظالم کیے گئے جو اشتراکی انقلاب کا خاصہ ہیں، یعنی قتل و غارت گری، لوٹ مار، دہشت انگیزی، اعلیٰ و متوسط طبقوں کے مال پر قبضہ اور املاک کی ضبطی وغیرہ،

ان مغلوب و محکوم حکومتوں نے اشتراکیت کے ظلم و جبر کے سامنے سپر نہیں ڈالا، ترکستان کے دارالحکومت بخارا میں مشہور لیڈر انور پاشا کی قیادت میں ۱۹۲۰ء و ۱۹۲۲ء میں دوبارہ بغاوت اور شورش برپا ہوئی جو وہاں کے آٹھ صوبوں میں سے چھ میں پھیل گئی، مسلمانوں کی اس زبردست کامیابی سے اشتراکیوں کو شدید دھکا لگا، آخر کار انھوں نے

اس کو فرو کرنے کے لیے ۸۰ ہزار کی فوج بھیجی، اسکے نتیجہ میں انور پاشا کی شہادت ہوئی اور بغاوت کو پوری فوجی طاقت سے دبا دیا گیا، جب اشتراکی حکومت کا راستہ بالکل ہموار ہو گیا اور اسکو اپنی قوت پر پورا اطمینان بھی ہو گیا تو اس نے ۱۹۳۲ء میں یہ اعلان کیا کہ "سوویٹ یونین کے تین کروڑ مسلمان ابتک کسی مزاحمت کے بغیر آزادی سے رہتے ہیں مگر قرون وسطیٰ کے لغو و باطل مذہبی عقیدوں کو مانتے ہیں اور بغاوت کرکے ملک کو نقصان پہنچانا چاہتے ہیں اس لیے غور و فکر کے بعد ایسی حکمت عملی مرتب کرنے کا فیصلہ کیا گیا جس کے ذریعہ انکے بہترین افراد کے اذہان سے باطل عقیدوں کو ختم کر دیا جائے"،

اس کے بعد مدرسوں میں اسلامی تعلیم ممنوع قرار دیدی گئی، مسجدوں میں قفل لگا کر انکو شراب خانوں، رقص و سرود اور فسق و فجور کے مرکزوں میں تبدیل کر دیا گیا، مسلمانوں کی دلآزاری کیلیے سمرقند کی مشہور جامع مسجد کے پاس ملحدین کی انجمن قائم کیگئی، صرف ترکستان میں ۱۴ ہزار مسجدوں کو بند کر دیا گیا، دین کے خلاف جذبات ابھارنے کیلیے مختلف قسم کے کلچرل پروگرام بنائے گئے۔

جن مسلمانوں کیلیے بھاگ جانا ممکن ہوا وہ ہجرت کرکے ہندوستان، افغانستان، ترکی، ایران اور مکہ و مدینہ چلے گئے، ایک مہاجر ترکستانی عالم محمد معصومی نے جو حرم شریف میں درس دیتے تھے مجھے بتایا کہ کمیونسٹ مسلم نوجوانوں سے کہتے تھے کہ اپنے علماء کی باتیں نہ مانو وہ جس جنت کا وعدہ کرتے ہیں وہ مؤجل ہے، ہم تم کو فوراً جنت دیں گے، باغوں اور پارکوں کو رقص و سرود اور فسق و فجور کا مرکز بنا کر نوجوان مردوں اور عورتوں کو کھلی آزادی دیدی گئی تھی کہ جو چاہیں کریں۔

۱۹۳۲ء میں کمیونسٹ پارٹی نے اعلان کیا کہ "۱۹۳۷ء تک کوئی عبادتگاہ باقی نہ رہ سکے گی، خدا پرستی کا وہ تصور جو قرون وسطیٰ کے تاریک دور کی یادگار ہے ختم کر دیا جائے گا"،

دوسری جنگ عظیم میں جب ہٹلر نے فوجکشی کی تو مجبوراً مسلمانوں کی تالیف قلب کے لیے انکو کچھ آزادی دیدی گئی لیکن جنگ ختم ہونے کے بعد جب اطمینان حاصل ہوا تو متعدد نئے شہروں کو سوویٹ یونین میں شامل کرکے مسلمانوں کی رہی سہی آزادی بھی ختم کر دی گئی، روسی کمیونزم نے اپنی ۷۰ سالہ عمر میں وسط ایشیا میں اسلام کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی ہے، اسکے گہوارہ میں جن نوجوان مسلمانوں کی نشو و نما ہوئی انھوں نے اپنے

آباء و اجداد کی مرضی کے برخلاف خدائے واحد پر ایمان لانے کے بجائے مادیت اور الحاد کو اپنا دین بنالیا ہے، اور جن مسجدوں سے تقریباً ۱۲ صدیوں سے اذان کی آواز بلند ہوتی تھی انکو بند کر دیا گیا ہے، اس سے زیادہ ہولناک مصیبت کی مثال چند صدی پہلے صرف اندلس میں ملتی ہے لیکن بیسویں صدی میں کمیونسٹ حکومتیں مسلمانوں کے ساتھ جو برتاؤ کر رہی ہیں وہ کم دردناک نہیں ہیں،

اسکے باوجود کمیونزم اپنے کو مظلوموں کا حامی اور استعماریت کا دشمن بتارہا ہے، اور مسلمانوں پر ان مظالم کو روا رکھنے کے باوجود اسلامی سلطنتوں سے دوستی اور تعلق کا دعویٰ بھی کرتا ہے، لیکن اس سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ اس منکر خدا اور مادہ پرست جماعت کے فریب میں آکر بعض مسلمان ممالک بھی اس سے اخلاص اور دوستی کا دم بھرتے ہیں، اور انکو اپنے ملکوں میں رسوخ قائم کرنے کا موقع بھی دے رہے ہیں، حالانکہ یہ لوگ انکے سراسر دشمن ہیں، یہی کمیونسٹ تھے جنھوں نے عرب ممالک کے خلاف زنجبار میں انقلاب کی اسکیم تیار کی اور انڈونیشیا کی بغاوت میں بھی انکا ہاتھ تھا،

ماسکو اور چین کی اشتراکیت میں کوئی فرق نہیں ہے، اور کیوبا اور یوگوسلاویہ کی اشتراکیت میں کوئی فرق ہے، کفر کا مذہب ایک ہی ہوتا ہے، اگرچہ اس کی صورتیں مختلف ہوں، زہر کو شہد میں ملا دیا جائے یا شیشہ و بلور میں رکھا جائے تو وہ بہر حال زہر ہی رہے گا۔

اشتراکیوں نے پروپگنڈہ کیلئے کچھ مسجدیں باقی رکھی ہیں، جب مسلم حکومتوں کے نمائندے ماسکو کا دورہ کرتے ہیں تو انھیں یہ باور کرایا جاتا ہے کہ مسلمانوں کو عقیدہ و عمل کی آزادی ہے، اور انکی عبادت گاہیں محفوظ ہیں، یہ صرف ایک جھوٹا اور سیاسی پروپگنڈہ ہے۔

بایں ہمہ اشتراکیت کے ظلم و تشدد پر پردہ پڑا ہوا ہے، یہ مسلمان اہل قلم اور دانشوروں کا فرض ہے کہ وہ اپنا مہر سکوت توڑ کر روس اور دوسرے کمیونسٹ ملکوں میں مسلمانوں پر کیے جانے والے ظلم و ستم کے خلاف آواز اٹھائیں، اس وقت اشتراکیت ہر مسلم ملک میں اپنی نمائشی دوستی کا اظہار کرکے وہاں اثر قائم کر رہی ہے، ان کے ظلم اور خطرناک عزائم سے مسلمانوں کو باخبر ہو کر آئندہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔

(اچ کمہ)

"ض"

ادبیات

جمال و کمال

از

جناب انجم خیرآبادی

اے کہ ترا نہ ہوگا اور تھا، نہ کوئی جواب ہے — "کن" بھی ترا کرشمۂ قدرتِ بے حساب ہے

اسمِ جمیل آپ کا فاتحۃ الکتاب ہے — یعنی کتابِ شوق کا ہر ورق انتخاب ہے

میں کہ ترا سوال ہوں تو کہ مرا جواب ہے — رازِ صدائے بازگشت منتظرِ خطاب ہے

حسنِ بیانِ زندگی ذکرِ دلِ خراب ہے — ساری کتاب میں یہی ایک مزے کا باب ہے

روح کو اک سکون ہے، دل کو اک اضطراب ہے — آج مرے خیال میں صبحِ ازل کا خواب ہے

اپنی خودی سے منفعل بحر میں ہر حباب ہے — دامنِ تر لیے ہوئے شرم سے آب آب ہے

دل میں شکستگی سی ہے، ہاں یہی فتحِ باب ہے — میری دعا کا حرف حرف شکر ہے، مستجاب ہے

حسن کی جلوہ گاہ میں، حسن ہے ہر نگاہ میں — آئینے میں ہے آفتاب، آئینہ آفتاب ہے

ہے جو یہ منظرِ جمیل، عکس ہے حسنِ ذوق کا — شوق، کہ دل میں تھا خیال آنکھ میں آکے خواب ہے

شوق نے دی صدائے شوق، گونج اٹھی فضائے شوق — پھر کے وہی صدائے شوق آئی، یہی جواب ہے

لینے نہ جانا تھا کہیں، شوق کچھ آج کا نہیں — روزِ ازل سے بس یونہی روح میں اضطراب ہے

جملہ خلاصۂ کتاب یوں تو ہے ایک حرفِ "دل" — ورنہ، جو حرفِ شوق ہے اپنی جگہ کتاب ہے

میکدۂ خضر کا مقام، عرش کا ہر طرف نظام — چشمۂ آفتاب جام نور بقا شراب ہے

کرتے ہیں رند آب آب "پیر مغاں! پلا شراب" — داروئے تشنگی یہی شعلۂ آب آب ہے

اٹھی جو یک بیک نظر ساقیِ مست کی اُدھر — خوشہ جہاں تھا شاخ پر اپنی جگہ شراب ہے

آفتِ جاں، بلائے ہوش، اُف وہ نگاہِ مے فروش — جان میں جس سے سوخروش، روح میں اضطراب ہے

مطربِ مے ہیں سب ہوس، دل میں رسا ہے یہ رس — اپنی جگہ نفس نفس زمزمۂ رباب ہے

کاسہ نگوں کیے ہوئے، کیفِ خودی لیے ہوئے — جامِ فنا پئے ہوئے، بحر میں ہر حباب ہے

خضر کے جب نہیں صفات، تجھ سے بنے گی خاک بات — ہے یہیں چشمۂ حیات اور یہیں سراب ہے

موج نے توڑ کر طلسم، اپنی زبان میں کہا — دامنِ بحرِ زندگی بحرِ فنا حباب ہے

عزمِ سفر کا منتہیٰ بامِ بلندِ کبریا — تن میں قرارِ جان کا اصل میں اضطراب ہے

حسن کے زیرِ سایہ ہوں کیوں نہ تمام جلوہ ہوں؟ — میں، کہ حقیر ذرہ ہوں اور وہ آفتاب ہے

کیوں نہ ہو شخصیت عظیم؟ ہے تو سایۂ کریم
اپنی نگاہ میں اثیم آپ ہی انتخاب ہے

مطبوعات جدیدہ

تاریخ ہند پاکستان حصہ اول مرتبہ ڈاکٹر سید معین الحق صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ معمولی، کتابت وطباعت قدرے بہتر، صفحات ۷۵۶ مع گردپوش قیمت لعہ۹
پتہ دائرہ معین المعارف، ۳۰ نیو کراچی ہاؤسنگ سوسائٹی، کراچی ۵

اس وقت ہند و پاک کی تاریخ کے متعدد پہلوؤں پر جو مختلف نوعیت کے کام ہو رہے ہیں ان کی جانب حضرت سید صاحبؒ نے اہل علم کو متوجہ کرتے ہوئے دسمبر ۱۹۳۴ء کے معارف میں اس کا مفصل خاکہ پیش فرمایا تھا۔ اس پروگرام کے مطابق دار المصنفین نے ان کی نگرانی اور سرپرستی میں اس کام کو شروع کیا تھا جو اب بھی جاری ہے اور اس سلسلہ کی اکیس جلدیں یہاں سے شائع ہو چکی ہیں۔

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی تاریخ پر ڈاکٹر سید معین الحق کی نظر وسیع اور گہری ہے اور وہ اس کے بعض پہلوؤں پر اردو اور انگریزی میں کئی مفید کتابیں لکھ کر کافی شہرت حاصل کر چکے ہیں، ان کی یہ نئی کتاب ہندوستان کی عام تاریخ ہے جو تین جلدوں میں مکمل ہوگی۔ اس پہلی جلد کے شروع کے ۱۶ ابواب ہندوستان کی ابتدائی اور قدیم تاریخ اور آخر کے ۱۱ ابواب فتح سندھ سے لے کر لودی خاندان، علاقائی ریاستوں، بہمنی سلطنت اور وجے نگر کے حکمرانوں تک کے حالات پر مشتمل ہیں، اس ضمن میں سلاطین کے کردار و شخصیت، ان کے انتظامی، سیاسی، تمدنی اور عمرانی کارنامے اور خدمات اور دوسرے معلومات

بھی آگئے ہیں، عہد قدیم کے فنِ تعمیر اور سنگ تراشی پر بھی ایک مفید باب ہے، پھر مسلم سلاطین کے نظام حکومت، اقتصادی و معاشرتی اصلاحات اور مذہبی معاملات میں ان کی رواداری، علمی و ادبی سرپرستی، ہر دور کے مشہور مصنفین و مورخین کا مختصر تذکرہ اور فنِ تعمیر کے متعلق مفید معلومات ہیں، مختلف نقشے، عمارتوں کی تصویریں اور آخر میں ہندوستانی تاریخ کے اہم اور مشہور واقعات کے سنین کی ایک فہرست بھی درج ہے، لائق مصنف نے مستند معلومات فراہم کرنے میں محنت اور سلیقہ سے کام لیا ہے اور قدیم ماخذوں کے علاوہ جدید تحقیقات سے بھی فائدہ اٹھایا ہے، غلط واقعات و روایات کی تردید بھی کی ہے، گو یہ کتاب یونیورسٹیوں کے طلبہ کے لیے لکھی گئی ہے، اس لیے تفصیلات سے پرہیز کر کے اختصار کو مدنظر رکھا گیا ہے، تاہم عام قارئین کے لیے بھی اس کا مطالعہ مفید ہے، اس کے لب ولہجہ میں ہندوستانیوں کو بھی کوئی ناخوشگواری محسوس نہ ہوگی، انداز بیان میں اعتدال و توازن کو برقرار رکھا گیا ہے اس لیے جانبدارانہ اور جذباتی رنگ نہیں آنے پایا ہے۔ پاکستان کے مورخوں کو ہندوستان کے گذشتہ مسلمان حکمرانوں کی تاریخ لکھنے میں بڑی ذمہ داری سے کام لینا چاہیے، کیونکہ فارسی میں جو تاریخیں گذشتہ عہد میں لکھی گئیں، ان کے انداز بیان سے اس دور کی تاریخ کو بڑی حد تک نقصان پہنچ چکا ہے، اور موجودہ دور کی ہر قسم کی تحقیقات کے باوجود اس نقصان کی تلافی اب تک نہیں ہو سکی ہے، مسلمان اور خصوصاً پاکستان کے مورخوں کو اس تلخ تجربہ کو سامنے رکھنا ہے۔

الانابۃ الی شعر الصحابۃ۔ مرتبہ مولانا غضنفر حسین شاکر نائطی، تقطیع لمبی، کاغذ عمدہ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۵۵ قیمت ۱۲؍

پتہ جامعہ عربیہ دار السلام عمرآباد، شمالی ارکاٹ، مدراس

جنوبی ہند کے مشہور دینی مدرسہ دار السلام عمرآباد نے عربی مدارس کے نصاب میں اصلاح

کی غرض سے ایسی کتابیں شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے جو طلبہ کی علمی استعداد اور ذہنی و اخلاقی تربیت دونوں حیثیتوں سے مفید ہوں، یہ کتاب اس مفید سلسلہ کی پہلی کڑی ہے، ابھی اس کا پہلا حصہ شائع ہوا ہے جو، اشعرائے صحابہ کے قصائد کا مختصر انتخاب اور از ردیف الف تا دال پر مشتمل ہے، مرتب نے حاشیہ میں مشکل اشعار کے مفہوم، دقیق الفاظ اور نحوی ترکیبوں کی تشریح بھی کر دی ہے۔ دار العلوم ندوۃ العلما لکھنؤ نے اس قسم کی جو کتابیں شائع کی ہیں وہ نثری انتخابات پر مشتمل ہیں، یہ پاکیزہ شعری انتخاب عربی مدرسوں کے نصاب میں شامل کیے جانے کے لائق ہے۔

مخطوطۃ شعر الاخرس۔ مرتبہ ڈاکٹر یوسف عز الدین، متوسط تقطیع، کاغذ کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۳۴ قیمت تحریر نہیں، پتہ منشورات دار البصری بغداد

عبد الغفار بن عبد الواحد اخرس انیسویں صدی کا مشہور اور صاحب دیوان عراقی شاعر ہے، ۱۳۰۴ھ میں اس کا ایک نامکمل دیوان استنبول سے شائع ہوا تھا۔ اب اس شاعر کے بڑے قدرداں بغداد کے مشہور فاضل ڈاکٹر یوسف عز الدین ہیں، انھوں نے زیر نظر کتاب میں اس کے ۱۸ طویل و مختصر قصائد کو شائع کیا ہے، جو اس کے مطبوعہ دیوان میں نہیں تھے، فاضل مرتب نے ان قصائد کو دوسرے مخطوطات کی مدد سے محنت سے اڈٹ کیا ہے۔ شروع میں چند مخطوطہ قصائد کا عکس بھی دیدیا ہے۔ عربی زبان و ادب کے شائقین کے لیے یہ دلچسپ چیز ہے۔

جگر معاصرین و مخلصین کی نظر میں **بیسویں صدی کے چند اکابر غزل گو** **مختصر تاریخ غزل اردو**	از جناب ڈاکٹر محمد اسلام صاحب تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت مناسب، صفحات بالترتیب ۱۶۰ و ۹۶ و ۱۱۹ قیمت بالترتیب ۷؍ ۸؍ اور ۸؍

پتہ ڈاکٹر محمد اسلام مضطرب منزل، اجو ہری محلہ۔ لکھنؤ

ڈاکٹر محمد اسلام نے اپنے مقالہ "جگر مراد آبادی، حیات اور شاعری" پر لکھنؤ یونیورسٹی سے پی، ایچ، ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔ معارف میں ان کی کئی کتابوں کا تعارف کرایا جاچکا ہے، اب وہ تین چھوٹے چھوٹے رسالوں کے اور مصنف ہو گئے ہیں۔ "جگر معاصرین و مخلصین کی نظر میں" جگر کے متعلق ان کے عزیزوں، شاگردوں اور معاصرین کے دلچسپ تاثرات ہیں، اس میں جگر کے علاوہ خود ان کے احباب کی شخصیت و شاعری کے متعلق بھی معلومات ہیں، اکثر تاثرات عقیدت مندانہ ہیں لیکن بعض میں جگر کی شخصیت و شاعری کے کمزور پہلوؤں کی بھی نشاندہی کی گئی ہے، دوسرے رسالہ "بیسویں صدی کے چند اکابر غزل گو" میں اصغر، فانی، جگر، اثر اور فراق کے مختصر حالات اور ان کی شاعری پر مختصر تبصرہ کے ساتھ ان کے کلام کے نمونے مختلف عنوانات کے تحت دیئے گئے ہیں۔ "مختصر تاریخ غزل اردو" میں شروع سے اب تک کی غزلیہ شاعری کی مختصر تاریخ ۹ دوروں میں بیان کی گئی ہے، امید ہے کہ یہ رسالے طلبہ کے لئے مفید ہونگے ڈاکٹر محمد اسلام میں لکھنے کی صلاحیت موجود ہے اس لئے امید ہے کہ آیندہ وہ چھوٹے چھوٹے رسالے لکھنے کے بجائے اہم موضوعات پر مضامین اور کتابیں لکھ کر اپنی محنت و خوش مذاقی کا ثبوت دیں گے۔

انتخاب اردو۔ مرتبین کا نام تحریر نہیں، تقطیع متوسط، کاغذ کتابت و طباعت عمدہ ٹائپ، صفحات ۲۸۰ قیمت عہ/ ۴ پیسے پتہ ادبی پبلشرز ۸ شیفرڈ روڈ بمبئی ۸

اردو کے مضامین نظم و نثر کا انتخاب برابر شائع ہوتا رہتا ہے، زیر نظر انتخاب مہاراشٹر اسٹیٹ بورڈ آف سکنڈری ایجوکیشن نے ایس ایس سی امتحانات ۱۹۶۵ء تا ۱۹۶۸ء کے لئے شائع کیا ہے، پہلا حصہ تفصیلی مطالعہ کے لئے ہے اس میں ۸ مضامین ہیں، مضامین اور نظموں کے انتخاب میں رنگارنگی کے ساتھ حسن ذوق کا پورا ثبوت ہے، امید ہے کہ یہ انتخاب نہ صرف مہاراشٹر بلکہ اس سے باہر کے تعلیمی مدارس میں بھی مقبول ہوگا۔

"ض"

جلد ۹۹ ۔ ماہ محرم الحرام ۱۳۸۷ھ مطابق ماہ مئی ۱۹۶۷ء ۔ عدد ۵

مضامین

مقالات

باب التقریظ والانتقاد

ادبیات